www.urducouncil.nic.in

قیمت: -/10 ₹

آدمی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

اکتوبر 2020

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

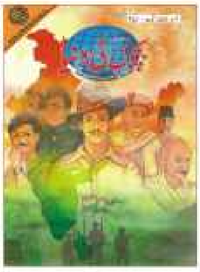

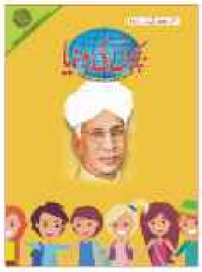

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان
ماہنامہ
خواتین دنیا
Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

جلد:4 شمارہ:10 اکتوبر 2020

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی
مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم ،محکمۂ اعلیٰ تعلیم ،حکومت ہند
مطبع: الیس نارائن اینڈ سنز، بی ۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی ۔ 110020
مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے
صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025، فون:49539000
نگارشات ارسال کرنے کے لیے
ای میل: kduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی ۔ 110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، چھتہ بازار/چھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	راجستھان کی اولین صاحب دیوان شاعرہ صالحہ بیگم پروین	ڈاکٹر راشد میاں	5
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		10
جہان نسواں	صفیہ اختر کی خطوط نگاری	ڈاکٹر محمد اظہار حسین	11
	نسائی جذبات واحساسات کی ترجمان: انجنا سنگھ سینگر	ڈاکٹر کہکشاں عرفان	16
	ڈاکٹر قیام نیر کا تخلیقی عمل	ڈاکٹر رخسانہ جمیل	20
	سرسید کا نظریۂ تعلیم نسواں	ڈاکٹر محمد امین میر	25
	جموں وکشمیر کی ثقافت اور افسانہ نگار	زمرودہ محمد میر	30
	'ایک چادر میلی سی' کے نسوانی کردار	نازیہ	33
قانون میں خواتین	ہندو خاتون کو موروثی جائیداد میں مشترکہ وراثت کا حق	خواجہ عبدالمنتقم	38
کہانیاں	ہجر نا تمام	ڈاکٹر عشرت ناہید	41
	شیشے کا گھر	ڈاکٹر حنا شائیم	44
	خاکی چھتری	آسیہ رئیس خان	46
حسن سخن	ابوبکر عباد، عنبرین فاطمہ		49
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		51
صحت	امراض اور پرہیزی غذائیں	شکیل احمد	53
آرائش وزیبائش	حسن کی نگہداشت		58
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		60
خواتین خبرنامہ			61

مشعل

مرکزی حکومت نے ملک میں اسکولی اور اعلیٰ تعلیمی سطح پر تبدیلی لانے کے لیے تعلیمی نظام میں تبدیلی کی ہے تا کہ زیادہ سے زیادہ تعلیم کو موثر بنایا جا سکے۔ اس نئی تعلیمی پالیسی میں نئے نئے اہداف اور مقاصد کو منظوری دی گئی ہے۔ 34 برس بعد ملک کی تعلیمی پالیسی کو مکمل طور پر تبدیل کیا گیا ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی میں 2035 تک اعلیٰ تعلیم میں اندراج کے تناسب کو بڑھا کر 50 فیصد کرنے کا ہدف بھی مقرر کیا گیا ہے۔

نئی تعلیمی پالیسی میں تمام طبقات کا خیال رکھا گیا ہے۔ سب سے اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ اس پالیسی کے تحت بچے ابتدائی تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کر سکتے ہیں۔ حکومت کا یہ قدم قابل ستائش اور قابل احترام ہے۔ اردو سے محبت کرنے والے اپنے بچوں کو اردو میڈیم سے تعلیم دلا سکتے ہیں جس سے ابتدائی سطح پر اردو زبان کا فروغ ہوگا۔ دوسری طرف ان ریاستوں میں جہاں اردو اکیڈمیاں نہیں ہیں وہاں بھی اردو اکیڈمیاں قائم کی جائیں گی تا کہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اردو زبان کا فروغ ہو سکے۔

یہ پالیسی اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں سبھی زبانوں کے فروغ کی بات کہی گئی ہے۔ ہمارا آئین بھی مادری زبان میں بنیادی تعلیم کی وکالت کرتا ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی میں ابتدائی کلاس سے پانچویں کلاس تک لازمی طور پر اور آٹھویں کلاس تک اختیاری طور پر تعلیم مادری زبان میں ہی دی جائے گی۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ جو لوگ ابتدائی تعلیم اپنی مادری زبان میں حاصل کرتے ہیں تو آٹھویں کلاس تک وہ اپنے میڈیم کے طور پر اردو کو منتخب کر سکتے ہیں۔ نئی تعلیمی پالیسی میں طالب علم اپنی جانچ اور تعین قدر خود سے کر سکیں گے۔ طالب علموں کو جدید طریقوں سے کوڈنگ سکھائی جائے گی اور ان کو ووکیشنل تربیت بھی دی جائے گی تا کہ وہ کتابی علم سے زیادہ عملی طور پر سیکھ سکیں۔ نئی تعلیمی پالیسی میں اس بات پر بھی کافی توجہ دی گئی ہے کہ کتابی علم سے زیادہ بچے عملی طور پر خود سے سیکھنے کی طرف توجہ دیں گے۔ اس پالیسی میں علاقائی زبانوں پر بھی ای کورس شروع کرنے کی طرف پہل کی جائے گی۔ ساتھ ہی ساتھ 2020 میں جو بچے اسکول چھوڑ چکے ہیں انھیں پھر سے اسکولوں سے جوڑا جائے گا۔ اس تعلیمی نظام میں اپنی پسند کے مطابق مضامین منتخب کرنے کی آزادی بھی دی جائے گی۔

نئی تعلیمی پالیسی میں خواتین کے تعلیمی معیار کو بلند کیا جائے گا ساتھ ہی ساتھ ٹیچر کی تقرری ایک مقررہ مدت میں ان کی کارکردگی کی بنیاد پر عمل میں آئے گی۔ اس پالیسی کے تحت ان طلباء کو مالی امداد بھی فراہم کی جائے گی جو کہ پسماندہ طبقات سے تعلق رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایسے طلباء جو مالی پریشانیوں کی وجہ سے تعلیم سے محروم ہو جاتے ہیں ان کو بھی مالی امداد دی جائے گی۔ اس پالیسی میں خواتین اور لڑکیوں کے لیے فنڈ میں بھی اضافہ کیا جائے گا تا کہ ان کے لیے خصوصی تعلیم کا انتظام کیا جا سکے۔ اس تعلیمی پالیسی کا مقصد نوجوان اور بالغوں کی شرح خواندگی کو سو فیصدی تک پہنچانا بھی ہے۔ یہ پالیسی اس لیے بھی اہم ہے کہ اس میں نئے انداز سے طلبہ کو تعلیم دی جائے گی۔ اس میں بہت سے اصلاحی پہلو بھی نمایاں ہوں گے۔

نئی تعلیمی پالیسی کا ہم سبھی کو خیر مقدم کرنا چاہیے اور امید کرنی چاہیے کہ یہ نئی تعلیمی پالیسی ملک کی سماجی، سیاسی اور معاشی صورت حال میں تبدیلی پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاکٹر راشد میاں

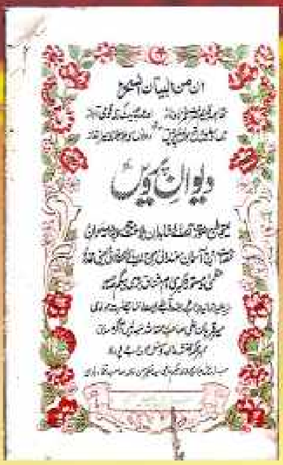

راجستھان کی اولین صاحب دیوان شاعرہ

صالحہ بیگم پروین

اردو شعرا و ادب کی ترویج و آبیاری میں خواتین کی کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ اردو کی ابتدا کے زمانے سے لے کر ایک عرصہ تک خواتین نثر نگار اور شاعرات کے نام اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر نہیں آئے تو اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ ایک طرف تو ہماری مشرقی سماجی نظام دوسرے فرسودہ خیالی اور بے پرواہی کے سبب ایک زمانے تک تذکرہ نگاروں اور تاریخ نویسوں نے شاذ ہی باکمال خواتین نثر نگار اور شاعرات کا ذکر کیا ہے۔ لیکن نثر ہو یا شاعری، ناول ہو یا افسانہ، تحقیق ہو یا تنقید ادب کے ہر شعبے میں خواتین فنکاروں نے اپنے وجود کا لوہا منوایا ہے۔ گزشتہ اواخر نصف صدی اور عہد حاضر میں تو نہ صرف شعر و ادب بلکہ حیات کے ہر شعبے میں خواتین مردوں کے شانہ بہ شانہ نظر آتی ہیں۔ مذکورہ زمانے کی خواتین نثر نگاروں کی فہرست قدرے طویل ہے۔ ان میں بعض اہم نام نامی یہ ہیں:

عصمت چغتائی، ڈاکٹر رشید جہاں، قرۃ العین حیدر، رضیہ سجاد ظہیر، بانو قدسیہ، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، فردوس حیدر، صالحہ عابد حسین، سلمٰی صدیقی، شکیلہ اختر، شفیق بانو، سرلا دیوی (ہمشیرہ کرشن چندر) وغیرہ۔ آزادی کے بعد مسرور جہاں، واجدہ تبسم، بشریٰ رحمٰن، عطیہ پروین، عفت موہانی، رفیعہ منظور الامین، جیلانی بانو، سلمٰی کنول، شہناز کنول، زاہدہ حنا وغیرہ۔

اسی طرح شاعری میں بھی شروعاتی زمانے سے لے کر عہد حاضر تک خواتین شاعرات نے اپنی امتیازی حیثیت کو بارہا ثابت کیا ہے۔ خواہ گیت ہوں یا لوک گیت، غزل ہو یا نظم تمام اصناف سخن میں خواتین کی امتیازی شمولیت رہی ہے۔ حالانکہ خواتین شاعرات میں صاحب دیوان کی تعداد بہت کم ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ مختلف گھریلو تقریبات رسومات میں شامل عوامی گیت، بارہ ماسہ، برساتی ملہار رس کی چار بیتیں و گیت جو ہیں تو مرد شاعروں کے تخلیق کردہ لیکن ان اصناف میں نسوانی احساسات کی بہترین ترجمانی موجود ہے۔ اسی طرح مرد شاعروں کی تحریر کردہ بعض مثنویوں کے مرکزی کردار 'مہ جبیں' عورت ہے۔ بعض دیگر منظومات میں بھی مرد شاعروں نے خواتین کے اہم مسائل بیان کیے ہیں۔

دراصل قدیم تاریخوں اور تذکروں میں خواتین شاعرات کے ناموں کا فقدان ہے۔ 'شمیم سخن' و دیگر تذکروں میں جن شاعرات کا ذکر ہے ان میں بیشتر طوائف پیشہ سے تعلق رکھنے والی خواتین ہیں۔ لیکن گنا بیگم (اہلیہ نواب عماد الملک ثالث شاگرد سودا) اور ملکہ زینت محل (زوجہ بہادر شاہ ظفر) اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والی اس عہد کی باذوق شاعرات ہیں جن کا ذکر ادبی تاریخ و تذکروں میں موجود ہے۔ مشہور ہے کہ ذوق نے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے کہنے پر شہزادہ جواں بخت کا سہرا لکھا تھا اس کا جوابی سہرا غالب سے تحریر کرنے کی فرمائش بیگم زینت محل نے ہی کی تھی اور مبارک بادی کے چند اشعار خود بھی تحریر کیے تھے۔

انیسویں صدی کے آخر سے بعض صاحب دیوان خواتین شاعرات کے نام منظر عام پر آتے ہیں۔ اسی عہد میں نواب مصطفٰی خاں

شیفتہ کی دو صاحبزادیاں مشرف جہاں ثروت اور منور جہاں مسرت صاحب دیوان شاعرات تھیں۔ چونکہ یہ دونوں شاعری میں امیر مینائی کی شاگردہ تھیں۔ لہٰذا ان کے کلام میں دہلوی اور لکھنوی رنگ سخن کا امتزاج نظر آتا ہے۔ مسرت ایک مشاق شاعرہ تھیں انھوں نے کئی مشہور و پیچیدہ زمینوں میں غزلیں کہی ہیں۔ ان کا رنگ سخن بطور نمونہ ملاحظہ ہو:

چلتے ہیں کس ادا سے وہ انداز دیکھنا
معجزنمائی نگہہ ناز دیکھنا
تو سخت گیر ہے کہ مسرت ہے سخت جاں
اب ہم کو ہے یہ غمزہ غماز دیکھنا

داغ دہلوی کی معشوقہ دلبر منی بائی حجاب کا کلام بھی معاشقۂ داغ کی وجہ سے بہت مشہور ہوا۔ حجاب کلکتہ کی مشہور طوائف تھیں۔ رام پور کے میلے میں پہلی مرتبہ دونوں کی ملاقات ہوئی جو معاشقے میں تبدیل ہوگئی۔ یہ تعلق ایک زمانے تک رہا مگر زیادہ عرصہ نہیں نبھا۔ فراق حجاب میں داغ نے 'فریاد داغ' کے عنوان سے ایک مثنوی بھی لکھی ہے۔ حجاب کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

وہ اور میرے گھر میں چلے آئیں خود بخود
سر پر مرے حجاب مگر آسماں نہیں
دھوم ہے گھر میں ہمارے یار آتا ہے حجاب
بہر استقبال اب یہ جان زار آنے کو ہے

اس عہد میں کلکتہ کی دیگر شاعرات میں صنم، شرم، شباب، نازاں، نقاب (چھوٹی بہن حجاب) وغیرہ عمدہ شاعرات تھیں۔

دہلی میں قدیم زمانے کی شاعرات میں مہ لقا بائی چندا نام کی صاحب دیوان شاعرہ گزری ہیں۔ یہ ایک طوائف پیشہ تھیں۔ دہلوی زبان و محاورات پر انھیں بڑی قدرت حاصل تھی۔ ان کے دو شعر بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

اخلاق سے تو اپنے واقف جہان ہے گا
پر آپ کو غلط کچھ اب تک گمان ہے گا
اِک لختِ پارہ پارہ کر ڈالو آئینے کو
پر کیا کروں کہ تیرا منھ درمیان ہے گا

بیگمات بھوپال میں نواب گوہر بیگم قدسیہ، شاہجہاں بیگم حیا، دونوں صاحب دیوان و صاحب کمال شاعرات تھیں۔ اس ضمن میں مغربی بنگال کی امیر بیگم (اہلیہ واجد علی شاہ) لکھنؤ کی شیریں، کانپور کی شوخ، جے پوری حسین (مقیم آگرہ) لکھنؤ کی حور (مقیم کلکتہ) ریاست جاؤرہ کی سکندر بیگم ضیا وغیرہ اہم شاعرات گزری ہیں۔

اردو شعر و ادب کی ترویج و اشاعت میں ہندوستان کی دیگر ریاستوں اور صوبوں کے ساتھ صوبۂ راجستھان کی بھی اہم خدمات رہی ہیں۔ جہاں تک شاعرات کا تعلق ہے، اب تک کی تحقیق کے مطابق ریاست جے پور کی صالحہ بیگم پروین کے علاوہ ریاستی زمانے میں (آزادی سے قبل) اس صوبے کی کسی بھی شاعرہ کا دیوان مرتب نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر حبیب الرحمٰن نیازی رقم طراز ہیں:

''جہاں تک میری معلومات ہے راجستھان میں کوئی صاحب دیوان شاعرہ نہیں ہوئی۔ ریاست جے پور کی صالحہ بیگم پروین کی ہی ایسی ہستی نظر آتی ہے جس کی ادبی اور شاعرانہ حیثیت پر راجستھان کو فخر ہونا چاہیے۔ پروین کا دیوان دو مرتبہ طبع ہوا۔ پروین نے ہر صنف سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے کلام کو دیکھ کر ان کی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اپنے بڑے بھائی سید نظیر حسن سخا دہلوی کی شاگردہ تھیں۔ پروین کے دادا تاج العلماء خان بہادر مولانا نجف علی صاحب قاضی القضاۃ تھے۔ انھوں نے اپنے آبائی عہدہ قضا کو چھوڑ کر انگریزی گورنمنٹ کی نوکری کر لی تھی اور متعدد عہدوں پر سرفراز رہے گورنمنٹ سے خان بہادر کا خطاب ملا۔ آخر (میں) ریاست ٹونک میں نوابی خاندان کے استاد ناظم فوجداری اور عامل چہرہ رہے۔ 28 ذی الحجہ 1298 ھ کو ٹونک میں ہی انتقال ہوا۔''

(ماہنامہ شفق، ٹونک، شمارہ 7 جنوری، فروری 1999، ص 38)

''مولانا نجف علی صاحب عربی و فارسی زبانوں پر دسترس رکھنے کے علاوہ بہترین شاعر بھی تھے۔ انھوں نے دیگر اصناف سخن کے علاوہ مخصوص عوامی صنف 'چار بیت' میں بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کی تحریر کردہ چار بیتیں اکثر دیگر حضرات کے نام سے منسوب ہیں۔

(چار چاند، مرتبہ محمد عبدالحئی فائز، 1994 راجستھان۔ اردو اکادمی جے پور کے صفحہ 9 پر مولانا ابوالکلام آزاد عربی و فارسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک کے فاؤنڈر ڈائرکٹر صاحبزادہ شوکت علی خاں نے لکھا ہے کہ 'نواب محمد علی خاں بہادر کے زمانے میں مولانا نجف علی جھجھری نے خوب چار بیتیں کہیں، لیکن دوسروں کے نام سے')

مولانا نجف علی کے فرزند و جانشین مولوی سید غضنفر علی بھی اپنے والد کی طرح کئی علوم پر دسترس رکھتے تھے۔ آپ کئی عربی و فارسی کتب کے مصنف ہونے کے علاوہ کئی فنون کے ماہر بھی تھے۔ آپ کی تصانیف میں قصائد بے نقطے اور علمِ رَمل سے متعلق 'دانش دانیال' نہایت اہم تصانیف

ہیں۔آپ کی شادی نواب اکرام الدولہ صفدر خاں کی پوتی سے ہوئی تھی۔ مولوی صاحب کے دولڑکے مولوی سید نظیر حسن سخا اور مولوی سید امیر حسن سہا محدث دہلوی تھے۔ یہ عربی و فارسی کے علاوہ بھی کئی زبانوں کے ماہر اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ مذکورہ دونوں حضرات کے بعد مولانا کے گھر جس لڑکی کی ولادت ہوئی اس کا نام سیدہ روشن آرا بیگم رکھنے کے ساتھ صالحہ بیگم کا لقب بھی دیا گیا۔جن کا تخلص بعد میں 'پروین' ہوا۔

پروین نے چونکہ ایک علما و اتقیا کے گھرانے میں آنکھ کھولی تھی جہاں عربی و فارسی کی تعلیم ضروری ہونے کے ساتھ علمی باتوں کا چرچا عام تھا۔ پروین کے نانا اس زمانے کے مشہور طبیب تھے جن سے پروین نے طب کی درسی تعلیم حاصل کی۔ نانا کے یہاں انھوں نے نبض دیکھنا، نسخہ لکھنا وغیرہ ہنر سیکھے یہاں تک کہ وہ خود ایک حاذق طبیبہ بن گئیں۔ پروین کو دیگر علوم کے ساتھ علم قیافہ پر بھی دسترس حاصل تھی۔

پروین کی شادی اول ریاست بھوپال کے سادات میں ہوئی تھی۔ وہاں ان کے ایک لڑکے کی ولادت ہوئی۔ مگر جلد ہی وہ بیوہ ہو گئیں۔ ان کی دوسری شادی سید میر قربان علی صاحب جے پوری سے ہوئی تھی۔ آپ ایک عالم طریقت اور صوفی کامل انسان تھے جو ریاست جے پور میں ممبر کونسل وزرا اور ایجنٹ جنرل کے عہدے پر فائز رہے۔ میر صاحب خود ایک باذوق شخصیت تھے۔ گاہ گاہ اشعار گوئی کا ذوق تھا۔ نسیم تخلص فرماتے تھے۔ پروین کی علمی لیاقتوں اور شعری صلاحیتوں میں میر صاحب کے یہاں مزید اضافہ ہوا۔ پروین کو برجستہ گوئی اور برمحل اشعار کہنے پر بڑی قدرت حاصل تھی وہ بھی آمیزش ظرافت کے ساتھ۔ ان کی برجستہ گوئی اور حاضر جوابی کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ ایسے ہی ایک مختصر واقعہ ڈاکٹر حبیب الرحمٰن نیازی نے قلمبند کیے ہیں۔ ملاحظہ ہوں:

"پروین کو عبادت اور ریاضت کا شوق تھا اور سسرال میں اس کا ہر وقت چرچا بھی تھا۔ پروین ہر وقت تسبیح پڑھتی رہتی تھیں میر صاحب نے ان کے ہاتھ میں تسبیح دیکھ کر فرمایا۔

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خسر
ایں چنیں تسبیح کد دارد اثر

پروین نے جواب دیا۔

نصیب ماست بہشت اے خدا شناس برد
کہ مستحق کرامت گنہگار انند"

(شفق، ٹونک، جنوری، فروری، 1999، ص 39)

جے پور میں میر صاحب سے پروین کے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔

میر قربان علی صاحب 3 رجب 1325 مطابق 1907 کو جے پور میں انتقال فرما گئے۔ وہ اپنے باغ المشہور 'میر جی کا باغ' میں سپرد خاک کیے گئے۔

> "پروین ایک قادر الکلام شاعرہ ہونے کے علاوہ بہترین نثر نگار اور مترجم بھی تھیں۔ ان کی مطبوعات میں چند رسائل کے علاوہ" ترجمہ اخلاق محسنی'، تر احیاء المیت فی فضاء اہل بیت' رسالہ طب موسوم بہ علاج المرضا بالماء والغذا، رسالہ صلاح الدین، 'سفر نامہ حجاز' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔"

پروین ایک قادر الکلام شاعرہ ہونے کے علاوہ بہترین نثر نگار اور مترجم بھی تھیں۔ ان کی مطبوعات میں چند رسائل کے علاوہ "ترجمہ اخلاق محسنی'، تر احیاء المیت فی فضاء اہل بیت' رسالہ طب موسوم بہ علاج المرضا بالماء والغذا، رسالہ صلاح الدین، 'سفر نامہ حجاز' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پروین کا دیوان پہلی مرتبہ 1913 میں زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔ دیوان سے متاثر ہو کر میر عثمان علی خاں، نظام حیدرآباد نے پانچ سو روپے کے عطیہ سے نوازا۔ اس تعاون سے دوسری مرتبہ پھر دیوان کی طباعت ہوئی۔ پروین کے دیوان سے متعلق تقریظیں تحریر کرنے والی شخصیات میں سرکرشن پرشاد شاد (وزیر دولت آصفیہ) میر صاحب کے فرزند سید عبدالرحمٰن نقوی (منتظم ساترات، ریاست جے پور) پروین کے پوتے سید انوار الرحمٰن بسمل جے پوری (نائب ناظم، ریاست جے پور) وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ سرکرشن پرشاد شاد نے اپنی تقریظ میں لکھا ہے کہ:

"اگرچہ زمانہ حال میں علوم قدیم کی تعلیم یافتہ بیویوں کا وجود الشاذ کالمعدوم ضرور ہے۔ تاہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ زمانہ ایسے پاک نفوس سے بالکل خالی ہے۔ فقیر شاد کے نزدیک ہی نہیں بلکہ معزز ناظرین کے روبرو بھی اس دعوے کی بین دلیل یہ ہی دیوان پروین ہے، جو پیش نظر ہے۔

فصاحت، بلاغت، سلاست میں اچھا پایا ہے۔ زبان و محاورات کے برمحل استعمال سے طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ غرض ایک نامی شاعر کے لیے جن امور کی ضرورت ہے وہ من کل الوجوہ اس دیوان میں موجود ہیں۔"

(4۔ ایضاً، ص 40)

دیوان پروین کا دیباچہ مولوی سید نظیر حسن سخا دہلوی نے لکھا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ شعروادب سے قطع نظر پروین کو حکمت، طب، نجوم ورمل میں بھی بڑی دستگاہ حاصل تھی۔ وہ عربی، فارسی اور اردو زبانوں کی ماہر تھیں۔ انھوں نے فارسی اور اردو زبانوں میں اشعار کہے۔ ان کے دیوان میں غزلیات کے ساتھ مستزاد، قطعات، رباعیات، ترکیب بند، مخمس، تضمین، قصائد، تاریخ وغیرہ بیشتر اصناف سخن موجود ہیں۔

پروین کے اشعار میں سادگی، سلاست، روانی اور معنی آفرینی جیسے اوصاف جو دہلوی اساتذہ کا طرۂ امتیاز سمجھے جاتے ہیں بخوبی جلوہ گر ہیں۔ چھوٹی بحر اور آسان الفاظ میں کہے گئے بعض اشعار سے ان کی مہارتِ فن ظاہر ہوتی ہے۔

شب وصل ساری بسر ہو گئی
کہا، مان جاؤ سحر ہو گئی

سر جھکائے ہوئے ہیں محفل میں
شرم کتنی ہے چشم نرگس میں

وہ جو بے وجہ مسکراتے ہیں
سینکڑوں وہم دل میں آتے ہیں

آتو نکلے ہو ادھر یہ دو قدم پر گھر رہا
دیکھتے جاؤ تڑپنا عاشق ناشاد کا

پروین نے علمائے طریقت کے خاندان میں ولادت پائی۔ دورانِ پرورش بھی صوفیا سے قربت رہی۔ لہٰذا ان کے کلام میں صوفیانہ رنگ وروش کا جلوہ جابجا دیکھنے کو ملتا ہے۔

وہ دل میں جلوہ فرما تھا مگر تقدیر کی گردش
تلاشِ یار میں پھرتا رہا میں کو بکو برسوں

کہا جو حشر میں کیوں کی خطا، تو پوچھوں گا
کہ تیرا نام غفور الرحیم تھا کہ نہ تھا

گناہ حشر میں سب عفو ہو گئے پروین
میرا کریم غفور الرحیم تھا کہ نہ تھا

رنگ تصوف کے علاوہ ان کے کلام میں عشق حقیقی اور عشق مجازی کی حلاوت بھی ہے، تو وہیں قلبی کیفیات کی بہترین ترجمانی بھی۔ دلکش تشبیہات واستعارات ان کے حسن کلام کو دوبالا کر دیتے ہیں۔

غیر پر لطف وکرم کا جب نہ آیا کچھ جواب
بات یہ کہہ کر اڑا دی اس میں کچھ اسرار تھا

اتنی ہی اس کی ملاقات کی خواہش ہوگی
جس قدر وہ مرے احوال سے غافل ہوگا

رحم کرائے شمع پروین پر تو بے رونق نہ ہو
لَو کی جنبش سے نہ کر ظالم اشارہ صبح کا

پروین نے اپنی شاعری میں مختلف طرز ورویوں کو برتنے میں شدت اور جانب دارانہ رخ کے بجائے نرمی اور اعتدال پسندی سے کام لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں مختلف طرز واندازی کی ترجمانی میں امتزاجی کیفیت دیکھنے کو ملتی ہے، ان کے یہاں قدامت اور جدت کا بھی بہترین امتزاج ہے۔ وہ خود فرماتی ہیں۔

تھا عہد قدیم صرف غمزۂ و ناز
اور عہد جدید کی ہے قومی آواز
میں وسط میں واقع ہوں لہٰذا پروین
دونوں سے ملا جلا ہے میرا انداز

پروین نے اپنے کلام میں فنکارانہ دسترس کے ساتھ اپنے زمانے کے ملکی وملی مسائل سے بے رخی اختیار نہیں کی، بلکہ بعض مسائل پر تو بے باکانہ انداز بیان اختیار کیا۔ وہ تعلیم نسواں کی پیروی کے ساتھ مغرب کی اندھی تقلید اور انگریزی حکومت کی مخالفت میں پیش پیش رہیں۔

ملتا نہیں کہیں دہنِ یار ہے اناج
فاقوں سے جسم ہے کمرِ یار آج کل

کیا کام ان سفید چڑیلوں کا ہند میں
کیوں ایسی شادیوں کی ہے بھر مار آج کل

خدا وندا انھیں کس دن شعور آئے گا دنیا میں
رہیں گی بے پڑھی لکھی ہماری لڑکیاں کب تک

حشر میں بھی نہیں پروین کو امید انصاف
واں بھی یہ سارا زمانہ سو قاتل ہوگا

لیکن پروین زمانے کے پیچیدہ حالات ومسائل سے مایوس نہیں بلکہ وہ حکم خداوندی لا تَقْنَطُوْ مِنْ رَّحْمَۃِ اللہ کی پیروی میں حوصلے وامید کا دامن تھامے نظر آتی ہیں۔

خیال آیا کہ دنیا ظلم سے کیوں مٹ نہیں جائے
کہا امید نے اے شخص ہم اس کو سنبھالے ہیں

میر قربان علی صاحب کی وفات کے بعد پروین نے اپنی بقیہ عمر کا بیشتر حصہ عبادت میں گزارا۔ بالآخر 27 ذی قعدہ 1363ھ بروز جمعرات وفات پائی۔ وصیت کے مطابق لوحِ مزار پرانہی کا یہ شعر تحریر کیا گیا۔

روح بے کس پہ میری فاتحہ پڑھتے جاؤ
اِدھر آئے ہو تو احسان یہ کرتے جاؤ

لوح مزار پر مولوی سید انوار الرحمٰن بسمل جے پوری کے ذریعہ کہی گئی تاریخ وفات مرقوم ہے۔

ام مشتاق حضرت پرویں
جاں بحق داد و یافت اجر جزیل
بست ہفتم ز ساہ ذیقعدہ
چار شنبہ بخلا گشت نزیل
بہر سال وفات ہاتف گفت
اُدخُلی جنتی مع الجبریل

1363ھ

□□□

Dr. Rashid Miyan
Assistant Professor
Govt. College
Tonk-304001 (Raj)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.............................. بتاریخ..............................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

شاعرات کے منتخب اشعار

کمھلائے کوئی پھول تو آنچ آتی ہے دل پر
کس جذبۂ بے نام سے وابستہ رہے ہیں

شاید ادھر سے قافلۂ رنگ و بو گیا
خوشبو کی سسکیاں ہیں ابھی تک ہواؤں میں

ادا جعفری

روشنی کے ہالے میں رقص ہے جنوں پرور
یوں اڑا اڑا لیکن رنگ گلستاں کیوں ہے

دشت تو دشت تھا گلشن میں بھی وحشت سی ہے
کارواں کون سی منزل پہ رواں ہے اے دوست

زبیدہ تحسین

اے چارہ گرو! یہ رخِ بےداد تو دیکھو
ہم سے وہ ادا ساز نہ خوش ہے نہ خفا ہے

جدائیاں تو یہ مانا بڑی قیامت ہیں
رفاقتوں میں بھی دکھ کس قدر ہے کیا کہیے

زہرا نگاہ

اے عمرِ رواں کاسۂ جاں اب بھی ہے خالی
اک دردِ دل اپنا ہے، سو وہ تیری عطا ہے

یہ دشتِ جاں کی مسافت مہیب تر ہوتی
اگر نہ رشتۂ احساس معتبر ہوتا

ساجدہ زیدی

تمہاری شکل بھی دھندلا گئی نگاہوں سے
بھرے ہوں آنکھ میں آنسو تو کیا نظر آئے

تمھیں گلہ ہے ادا ناشناس دنیا سے
ہمیں بھی غم ہے کہ اپنا مزاج داں نہ ملا

وحیدہ نسیم

یہ کس کی یاد در آئی ہے چاندنی بن کے
یہ کس نے جھک کے پکارا ہے بامِ ماہ سے آج

پھر کوئی آئے عیادت کے لیے ممتاز جی
پھر نصیب دشمناں ہم آج کل بیمار ہیں

ممتاز مرزا

سرخ مٹی کی ردا اوڑھے ہے نیلا آکاش
نہ شفق پھولے نہ رم جھم کہیں بادل برسے

ہم نے طوفان سے پیمانِ وفا باندھا ہے
کہہ دو ہر موجِ تلاطم سے مقابل ہو جائے

زاہدہ زیدی

گھر کے سارے شیشے آخر کس نے چکنا چور کیے
مجھ کو اپنی جان سے پیارے اپنے سب ہمسائے تھے

اٹھ اٹھ کے بار بار کسے ڈھونڈھتی ہے لہر
شاید بچھڑ گیا ہے سمندر سے بھی کوئی

رشیدہ عیاں

ڈاکٹر محمد اظہار حسین

صفیہ اختر کی خطوط نگاری

اردو مکتوب نگاری کی تاریخ میں جن خواتین کے خطوط کو ادبی شہرت حاصل ہوئی ان میں صفیہ اختر کے خطوط نمایاں ہیں۔ صفیہ اختر مشہور ترقی پسند مصنفہ جانثار اختر کی بیوی، شاعر انقلاب مجاز کی بہن اور فلمی نغمہ نگار جاوید اختر کی والدہ تھیں۔ 1953 میں ان کا انتقال ہوا۔ صفیہ اختر شعبہ تعلیمات سے وابستہ تھیں۔ وہ اعلیٰ ادبی ذوق کی حامل تھیں۔ صفیہ اختر کے خطوط کے دو مجموعے شائع ہوئے ایک 'حرف آشنا' اور دوسرا 'زیر لب'۔ یہ دونوں مجموعے ایک ایسی خاتون کے موئے قلم کے مترشحات ہیں جن کی ادبی شناخت ان ہی خطوط کے حوالے سے ہے۔ حالانکہ صفیہ اختر کا ایک مضامین کا مجموعہ 'انداز نظر' کے نام سے بھی ہے، لیکن وہ وقت کے گرد میں دب کر رہ گیا۔ اہل نظر کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرنے سے قاصر رہا۔ صفیہ اختر کے یہ خطوط امتداد زمانہ کے باوجود بار بار پڑھے جانے کا تقاضہ کرتے ہیں۔ ان میں ادبی رعنائی، طرز ادا کی جدت اور اعلیٰ انسانی اقدار کی ترجمانی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ خطوط کے دلچسپ ہونے اور زمانی ومکانی قیود کو عبور کرنے کے متعدد محرکات ہو سکتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان خطوط میں وہ کیا طلسم ہے جس کی تابندگی ابھی تک اہل نظر کو مخمور کیے ہوئے ہے۔ خطوط کے مشہور ہونے کے متعدد اسباب ہو سکتے ہیں۔ خطوط کو تاریخی مواد کی حیثیت سے پڑھا جاتا ہے۔ خطوں کو کسی شخص کی ذاتی زندگی میں جھانکنے کا ایک دریچہ تصور کیا جاتا ہے۔ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان کے تعلقات اور اس کی نوعیت کی نقاب کشائی کا بہترین وسیلہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ علماء کے خطوط کی طرف علمی مسائل و مباحث کی غرض سے بھی رجوع کیا جاتا ہے۔ 'خطوط غالب' کی شہرت کی بھی وجوہات تاریخی ہیں۔ غالب کے خطوط اہل نظر کے علمی وادبی ذوق کا سامان فراہم کرتے تھے۔ غالب کے خطوط کو اردو نثر کے نقطۂ آغاز کے طور پر پڑھا گیا، ایک عظیم اور خلاق ذہن کے افکار عالیہ کی حیثیت سے ان کا مطالعہ کیا گیا۔ کیا صفیہ اختر کے خطوط کو پڑھنے کے یہ حوالے ممکن ہیں۔ کیا صفیہ اختر کے خطوط کی قرأت سے وہی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں جو خطوط غالب سے کی جاتی ہیں یقیناً اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ سوال اٹھتا ہے کہ آخر وہ کیا اسباب ہیں جن کی بنیاد پر صفیہ اختر کے خطوط ہنوز اہل ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتے رہے ہیں۔ خالص ذاتی نوعیت کی تحریر جس کا مقصد سوائے پیغام رسانی اور حالات سے مطلع کرنے کے علاوہ

اور کچھ نہیں ہوتا۔ آخراس میں وہ کون سی صفت ہے جس کو پڑھنے کے لیے قاری مجبور ہو جاتا ہے۔ ان خطوط میں کوئی ایسی سنسنی خیزی بھی نہیں ہے جو تو خیز قاری کے لطف کا سامان ثابت ہو سکے۔ نہ کوئی اہم تاریخی واقعہ مذکور ہے جس کے پڑھنے سے زمانے کے نشیب و فراز کا علم ہو سکے۔ ان خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ صفیہ اختر کے خطوط کے زندہ و تابندہ رہنے کے پس پردہ ان کی ادبیت ہے۔ وہ عظیم انسانی قدریں ہیں جن کے بغیر زندگی مشینی عمل محسوس ہوتی ہے۔

رشید احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ بہترین ادب لکھنے کے لیے آدمی کا اچھا ہونا ضروری ہے۔ یہ جملہ اس عہد کے مشینی ذہن کے لیے کتنا ہی تاثراتی کیوں نہ معلوم ہو لیکن ہے سو فی صدی سچ۔ صفیہ اختر کے خطوط سے ایک ایسی صفیہ کا تصور ابھرتا ہے جو سراپا محبت میں ڈھلی ہوئی ہے۔ جو ایثار کی مورت ہے۔ خودی سے سرشار اور وفاداری کا مجسمہ ہے۔ صفیہ اختر وہ عورت تھیں جنھوں نے لبوں پر کوئی شکایت کا حرف لائے بغیر غربت کی تمام تکلیفوں کو برداشت کیا۔ زندگی محض اپنے وجود کے اثبات سے نہیں گزاری جاتی ہے۔ اچھی زندگی کے لیے خود سپردگی لازمی ہے۔ صفیہ اختر اس کی عملی تفسیر تھیں۔ فاطمہ زہرا نے 'حرفِ آشنا' کے پیش لفظ میں کیا پتے کی بات لکھی ہے:

''جاں نثار سے صفیہ کی والہانہ محبت آج ہندوستان کی لاکھوں لڑکیوں کے ذہن میں ایک آئیڈیل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس محبت کی ابتدا دراصل ازدواجی زندگی کے ساتھ ہوئی اور وہ بھی اس طرح کہ صفیہ کی حیثیت طالب اور جاں نثار کی مطلوب کی رہی۔'' (ص 7)

ادب اعلیٰ اقدار حیات کا سرچشمہ اور مظہر ہوتا ہے۔ ادب زندگی کے انتشار اور بے کیفی کو توازن اور جمالیاتی حظ عطا کرتا ہے۔ عظیم ادب کی تشکیل میں جمالیاتی عناصر کے علاوہ فکر کی بلندی کا دخل اہم ہوتا ہے۔ اعلیٰ ادب کے لیے فن کار کا خلوص اور اس کے تجربے کی سچائی بنیادی شرط ہے۔ آپ بیتی کے جگ بیتی بن جانے کے لیے تخلیق کار کے جذبے کی صداقت لازمی عنصر ہے۔ لیو ٹالسٹائی کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''...سچے فنکارانہ تاثر کو قبول کرنے والا شخص فن کار سے مل کر اس طرح ایک ہو جاتا ہے کہ وہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ یہ کام خود اسی کا ہے اور اسی نے اسے تخلیق کیا ہے اور یہ وہی چیز ہے جس کے اظہار کی وہ ایک عرصے سے خواہش کر رہا تھا۔ ایک حقیقی فن پارہ نہ صرف اس کے اور فن کار کے درمیان بلکہ ان دوسروں کے درمیان کی بھی ساری دیواریں ڈھا دیتا ہے جو اس فن پارے سے متاثر ہوئے ہیں۔ اس طرح فن پارہ ہماری شخصیت کو علاحدگی اور تنہائی سے آزاد کر کے دوسروں سے ملا کر ایک کر دیتا ہے۔ اسی عمل میں فن کی مقناطیسی قوت اور مخصوص صفت کا راز پوشیدہ ہے۔''

(فن کیا ہے، بحوالہ ارسطو سے ایلیٹ تک، جمیل جالبی، ص 45)

'حرفِ آشنا' ان خطوط کا مجموعہ ہے جو صفیہ اختر نے جانثار اختر کے ہمراہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد انھیں لکھے تھے۔ کتاب پر ان خطوط کا زمانہ تحریر اکتوبر 1943 سے نومبر 1947 درج ہے۔

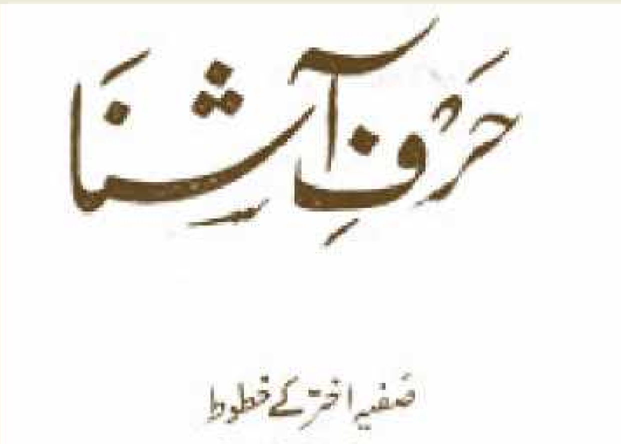

'حرفِ آشنا' کی مکتوب نگار ایک ایسی شوہر پرست عورت ہے جو ہندوستانی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔

ایک اچھی رفیق حیات محض روزمرہ کے فرائض ہی بخوبی انجام نہیں دیتی ہے بلکہ وہ اپنے شریکِ حیات کی خوابیدہ صلاحیتوں کو صیقل کرتی ہیں۔ ان کے اعتماد میں اضافہ کا موجب بنتی ہیں۔ فاطمہ زہرا لکھتی ہیں:

''صفیہ نے جاں نثار کو نہ صرف ذہنی رفاقت دی بلکہ انھیں ذہنی طور پر متاثر بھی کیا۔ جاں نثار کی فطرت میں بہت سی دبی

ہوئی خوبیاں تھیں جسے صفیہ نے ہی ابھارا اور سنوارا۔ مجھ سے پوچھے تو یہی کہوں گی کہ جاں نثار کو جینے اور مرنے کا سلیقہ صفیہ نے ہی سکھایا۔" (ص 9)

یہ خطوط دراصل وہ شیریں نغمے ہیں جو صفیہ اور جاں نثار اختر کے ایک دوسرے سے دور رہنے کے نتیجے میں معرض وجود میں آئے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان دونوں کی زندگی میں ایسے لمحات بہت کم آئے جب کہ دونوں قدرے طویل وقفے کے لیے ایک ساتھ رہے ہوں۔

ان خطوط سے صفیہ اختر کی معصوم شخصیت پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے۔ ازدواجی زندگی کے متعلق ایک جدید مشرقی عورت کے تصورات سامنے آتے ہیں۔

صفیہ ایک خط میں لکھتی ہیں:

"شوہر کا تصور اب میرے لیے ایک دیوتا کا تصور نہیں ایک دوست کا تصور ہے۔ لیکن ایک ایسے دوست کا تصور جو مجھ سے بہت سی باتوں میں فوقیت رکھتا ہو، خیالات میں، ارادوں میں، عمل میں اور پھر اس فوقیت کو تسلیم کرنے میں مجھے ایک ابدی سکون حاصل ہوتا ہے۔ شاید یہ جذبہ تعظیم ہی عورت کی فطری کمزوری ہے جس سے مرد ہمیشہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ اپنی ذہنی پختگی کے باوجود مجھے اپنی یہ نسائی کمزوری حسین نظر آتی ہے۔ یہی تصور تھا جس نے اب تک مجھے اپنی روح کے فروخت کرنے سے باز رکھا ورنہ شاید اس زندگی کے نرم گرم سہنے کی نوبت آچکی ہوتی۔" (ص 21)

ان خطوط کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صفیہ اختر کے فکر و خیال کا مرکز صرف اور صرف جاں نثار اختر رہے ہیں۔ ان خطوط میں جاں نثار اختر اور ان کے متعلقات کے علاوہ کوئی اور موضوع صفیہ کی نظر میں قابل اعتنا نہیں ہے۔ وہ تمام سماجی اور سیاسی مسائل بھول کر اس مرکز میں خود کو ضم کر لینے کی پوری کوشش کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ ان خطوط میں 1947 کے خوں چکا واقعات زیر بحث نہیں آتے ہیں۔ معاصرین کا ذکر بھی زیب داستان کے لیے نہیں ہے۔ اگر ہے بھی تو صرف شان الحق حقی اور ان کی اہلیہ سلمیٰ شان الحق، معین احسن جذبی اور چند دیگر خاندانی رشتہ داروں کا ہے۔

غرض کہ صفیہ ان خطوط میں اپنے اور مکتوب الیہ کے درمیان کے لطف تکلم کو کسی اور تذکرے سے مکدر نہیں کرنا چاہتی ہیں۔

دوسرے خطوط کا مجموعہ زیر لب سے بھی جذبے کی سچائی کا قدم قدم پر اظہار ہوتا ہے۔ بے لوث، پرخلوص، جذبہ محبت سے سرشار صفیہ کا قدم قدم پر احساس ہوتا ہے۔ 'زیر لب' سے ایک خط ملاحظہ کیجیے:

27 جون 1950 کو لکھنؤ سے صفیہ اختر لکھتی ہیں:

تمہارا خط ملا تھا۔ دو تین دن کیوں تمہیں خط نہ لکھ سکی ان جذباتی باتوں کو زبانی یا تحریر سے نہیں سمجھایا جاسکتا۔ خط پا کر پوری شام پر عجب فاتحانہ انداز طاری تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کائنات مجھے حاصل ہے اور دوسری صبح جو سو کر اٹھی تو اس کا ردعمل دیکھو کہ بات بات پر آنسو امڈے آتے تھے۔ کل دن بھر قلم اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی۔ بہتیرا خود کو سمیٹنا چاہا مگر قابو نہ حاصل ہوتا تھا۔ میری جان مجھے مضبوط رہنے دو اپنی خاطر، میں آہنی عزم اور استوار ارادے چاہتی ہوں۔"

(زیر لب، ص 72)

زیر لب
صفیہ اختر کے خطوط
جاں نثار اختر کے نام
۲۲ر دسمبر ۱۹۴۹ء سے
۲۹ر دسمبر ۱۹۵۲ء تک
صفیہ اختر

صفیہ اختر نے جاں نثار اختر کو ہر قسم کی محبت کا احساس دلایا۔ ایک خط میں لکھتی ہیں:

"آؤ تمہاری پیشانی پر ایسا پیار کر لوں جس میں ماں کی شفقت، بہن کا فخر، بیوی کا ایثار اور دوست کی ملائمت سبھی

کچھ شامل ہو میری جان۔" (زیرلب،ص 47)

زیرلب کے خطوط سے صفیہ اختر کی جو شبیہ ابھرتی ہے وہ روایتی اور منفعل عورت کے تصور سے قطعی مختلف ہے۔ مشرقی عورتوں کے سلسلے میں جو منفی تصورات قائم کرلیے گئے ہیں اس کے پس منظر نوآبادیاتی مقاصد ہیں۔ مشرقی عورتوں کے تعلق سے یہ مفروضات قائم کرلیے گئے ہیں وہ کمزور ہوتی ہیں۔ زندگی کی تگ و دو میں پیچھے رہنے والی اور گھر کی چہار دیواری میں محصور دنیا میں ہونے والی اتھل پتھل سے بے خبر ہوتی ہیں۔ صفیہ اختر کی زندگی اس مفروضے کی تردید کرتی ہے۔

جاں نثار بھوپال چھوڑ کر کسبِ معاش کی غرض سے فلمی دنیا میں اپنی قسمت آزمانے کے لیے بمبئی جاتے ہیں۔ صفیہ اختر جاں نثار اختر کو زندگی کے نشیب و فراز سے کس طرح آگاہ کرتی ہیں ملاحظہ کیجیے:

"تم کوشش کے سلسلے میں عجلت پسندی اور شدت سے کام مت لینا تھوڑا Poise برقرار رکھنا ضروری ہوتا ہے ورنہ دوسروں کو حاجت مندی کا احساس ہونے لگتا ہے اور یہ چیز معاملہ کو کمزور کردیتی ہے۔" (ص 29)

صفیہ اختر کس طرح جاں نثار اختر کی ڈھارس بندھاتی ہیں۔ تسلی دیتی ہیں ایک ایسے موقع پر جہاں بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔ صفیہ لکھتی ہیں:

"اختر تم میری طرف سے پریشان نہ ہو، سوچو اگر ہمیں جسمانی عیش میسر بھی ہوتا تو ان حالات کے اندر ذہنی سکون کہاں مل جاتا؟ سکون تو انہی لوگوں کو حاصل ہے جو قطعی طور پر بے حس ہو چکے ہیں۔ مجھے کوئی تکلیف، تکلیف نہیں معلوم ہوگی اگر مجھے اس کا یقین رہا کہ وہ کسی اعلیٰ مقصد کے لیے اٹھائی جارہی ہے۔ تم میرے قدم مضبوط پاؤ گے۔ میں تمہارا ساتھ دینے سے کبھی نہ تھک سکوں گی اس لیے کہ مجھے تمہاری محبت حاصل ہے۔" (زیرلب،ص 39)

زیرلب کے خطوط سے محض ایک وفا پرست شریک حیات اور حالات کے مارے شوہر کے شانہ بہ شانہ چلنے والی خاتون کا سامنا نہیں ہوتا ہے بلکہ ترقی پسند تحریک کے منشور کو اپنے ادراک اور مزاج کا حصہ بنا لینے والی خاتون سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہ جلسوں میں شرکت کرتی تھیں۔ صفیہ اختر ادب کا ذوق رکھتی تھیں۔ ان کی نشوونما ادبی ماحول میں ہوئی۔ وہ اپنے خطوط میں غالب، اقبال کے اشعار نقل کرتی ہیں۔ وہ جاں نثار اختر کی غزلوں پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتی ہیں:

28 جولائی 1950 کے ایک خط میں بھوپال سے لکھتی ہیں:

"غزل جو تم نے لکھی ہے۔ تمہارے زمانے سے کم دو سو برس پہلے والے شاعر کا رنگ تغزل ہے یہ بیٹھے بیٹھے تمہیں کیا سوجھتی ہے پھر بھی اس کے بعض اشعار مجھے بہت چبھ گئے۔

(زیرلب،ص 95)

اگر صفیہ غزل کا وہ شعر بھی نقل کرتیں تو صفیہ کی رائے کی معنویت دوچند ہو جاتی اس کے باوجود یہ اندازہ ہوتا ہے کہ صفیہ قدیم رنگ تغزل کو پسند نہیں کرتی تھیں جس کی نفی ترقی پسند تحریک نے بڑی شد و مد سے کی تھی۔ اس سے صفیہ کی ترقی پسندانہ طرز فکر کی غمازی ہوتی ہے۔ ایک مثال اور ملاحظہ کیجیے جس سے صفیہ کی تنقیدی بصیرت کا اظہار ملتا ہے:

16 ستمبر 1950 کے ایک خط میں بھوپال سے لکھتی ہیں:

"تمہاری نظم "ستاروں کی صدا" پر کرشن اور مہدی کا اعتراض جو تم نے لکھا ہے میری سمجھ میں نہیں آیا۔ بعض وقت انجمن میں عجیب الٹی سیدھی بحثیں ہوتی ہیں کرشن اور مہدی کا اعتراض تمہاری نظم پر تو کسی طرح صادق نہیں آتا۔ تم نے اوہام پرستی کو بنیاد ضرور بنایا ہے۔ لیکن اس کا غلط استعمال نہیں کیا بلکہ اوہام کو یہ توڑتی ہے۔ کرشن کو میں بڑا افسانہ نگار مانتی ہوں لیکن ان کی سخن فہمی کی میں قائل نہیں اور اختر تم کرشن سے ضرور پوچھنا کہ ان کے افسانے 'بت جاگتے ہیں' سے توہم پرستی پھیلتی ہے یا نہیں۔" (زیرلب ص 102)

فراق گورکھپوری نے لکھا:

"یہ خطوط ایک ایسا انسانی نوشتہ یا دستاویز Humant document ہے جس کی مثال بسا اوقات اچھے اور کامیاب ادب میں بھی ہمیں نہیں ملتی۔ ان خطوط کی ادبیت اگر تابناک ہے تو ان کی انسانیت تابناک تر ہے۔ ہر خط میں ایک من موہنی شخصیت کا دل دھڑکتا ہوا سنائی اور دکھائی دیتا ہے۔ آپ بیتی اور جگ بیتی کا سنگم ہر خط میں نظر آتا ہے۔ کاش اردو میں ایسی اور کتابیں دستیاب ہوتیں، لیکن آئے دن ایسی کتابیں کہاں شائع ہوتی ہیں۔" (ص 11)

'زیرلب' کے خطوط عام طور پر طویل ہوتے ہیں۔ طول بیانی قاری کے تجسس میں حارج ہوتی محسوس نہیں ہوتی ہے۔ مکتوب نگار دراصل سلسلۂ گفتگو کو دراز سے دراز تر کرنے کی متمنی نظر آتی ہیں۔ مکتوب الیہ کے احوال کی دریافت، مکتوب نگار کے قلبی واردات، بچوں کے واقعات کا بیان عام

طور پر زیرلب کے خطوط کو بوجھل بنانے کے بجائے پرلطف فضا قائم کرتے ہیں۔ کیف آور فضا کے پس پردہ مکتوب نگار کے خلوص، جذبات کی شدت کے علاوہ بے تکلف اسلوب ہے۔ بے تکلف اسلوب کی تاثیر مرصع اسلوب سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اس اسلوب سے فنکار کی ذہنی صلاحیت، فکری صلابت اور شخصیت کی خوداعتمادی اور اپنے مقصد سے وابستگی کا اظہار ہوتا ہے۔

یکم جنوری 1951 کے خط میں صفیہ لکھتی ہیں:

"مجھے تو تم سے وہ ملا جو دنیا میں تمہیں سے مل سکتا تھا۔ زندگی کے عظیم الشان تجربے سماج کی عزت، بچے، گھر، کردار، شخصیت، سبھی کچھ تو میں نے تم سے پایا۔ (ص133)

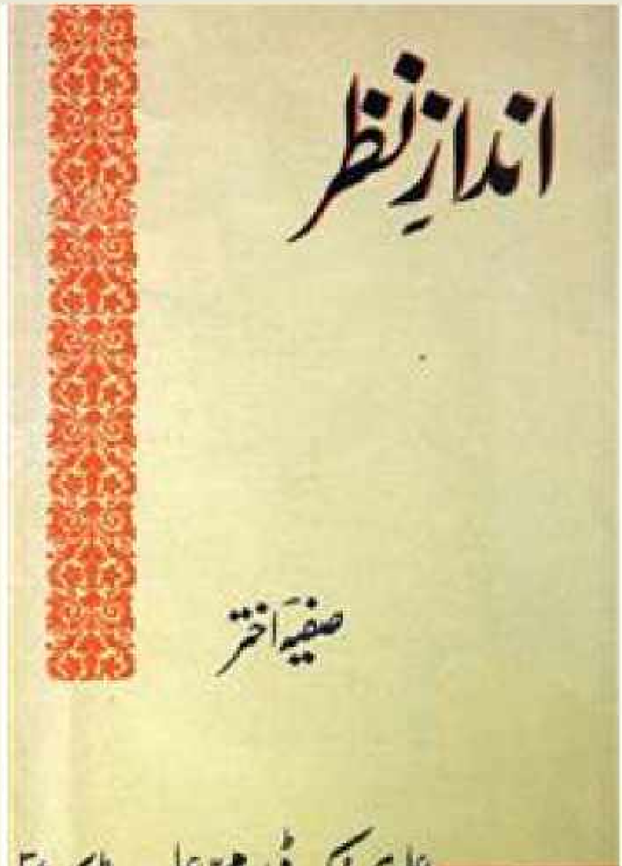

ایک اچھے خط کی پہچان بے تکلفی ہے۔ مکتوب نگار اس راز سے واقف ہوتا ہے کہ میری یہ تحریر مکتوب الیہ کے علاوہ کوئی اور نہیں پڑھے گا۔ ان دونوں کے درمیان ایک خموش معاہدہ ہوتا ہے دونوں ایک دوسرے کے نہاں خانہ قلب سے واقف ہوتے ہیں۔ مکتوب نگار اپنے پورے وجود کو تحریر کے وسیلے سے بے نقاب کر دیتا ہے۔ اس طرح مکتوب نگاری اظہار ذات کا موثر طریقہ ہے۔ صفیہ اختر ان خطوط میں اپنے پورے وجود کو اپنے مکتوب الیہ کے سامنے منکشف کر دیتی ہیں۔ ان خطوط کی دلکشی، رعنائی اور قاری کو اپنا اسیر بنا لینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔

ان خطوط میں صفیہ اختر نے اپنی زندگی کے کرب کو بغیر کسی لاگ لپیٹ کے بیان کیا ہے۔ یہ خطوط برہ کی آگ میں جلتی ہوئی عورت کی آتم کتھا ہے۔ یہ خطوط یوں تو دو لوگوں کے درمیان کی راز و نیاز کی باتیں ہیں لیکن ان کے مطالعے سے خودکلامی کا احساس ہوتا ہے۔ صفیہ اختر نے اپنی زندگی کے جن اضطرابات کو ان خطوط میں بیان کیا ہے اس پر ان کی ایک سہیلی سلمی شان الحق اپنی کتاب "شہیدان وفا کا خوں بہا کیا" میں لکھتی ہیں:

"یوں معلوم ہوتا ہے وہ کسی انسان سے نہیں دیوار سے مخاطب ہے وہ غیور لڑکی اپنے دل کے داغ کسی کو کیوں دکھاتی یہ تو یوں کہیے کہ ایک خودکلامی کی کیفیت ہے جسے عالم خیال میں وہ سپرد قلم کرتی گئی ہے۔ البتہ اس قدر زہرناکی کا بھی جواب نہیں کہ یہ خط اس کے پارہ ہائے جگر بہت احتیاط سے بطور البم سجائے جاتے رہے اور اپنے دل کے وہ زخم جو اس نے اپنے معتبر دوستوں کی نظر سے بچائے رکھی تھی اس کے مرتے ہی کتابی صورت میں شائع ہوئی اور اس اشتہار کے ساتھ گلی گلی بکنے لگی کہ یہ صفیہ کے خطوط ہیں جاں نثار کے نام۔ انھیں خرید لیجیے۔ اس سے جو رقم وصول ہوگی۔ اس سے صفیہ کا سنگ مرمر کا مزار تعمیر ہوگا۔"

صفیہ اختر کے یہ خطوط ادبی خطوط کے حوالے سے قابل ذکر ہیں۔ ان خطوط کے مطالعے سے ایک جدید مشرقی عورت کے تصور حیات اور مسائل حیات کے متعلق ان کے بصیرت افروز نقطۂ نظر کا اظہار ہوتا ہے وہیں اس ادبی سوال کا جواب بھی فراہم ہوتا ہے کہ نجی اور ذاتی تحریریں ادبی اوصاف و رموز سے کس طرح متصف ہوتی ہیں۔ صفیہ اختر کے ان خطوط میں وہ ادبی خصوصیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں جو ایک طویل عرصے تک قاری کو اپنی گرفت میں لیے رہتی ہیں۔

□□□

Dr. Mohd Izhar Hussain
Associate Professor
Dept. of Urdu, Nehru College
Bahadur Ganj
Kishangan-855101 (Bihar)

ڈاکٹر کہکشاں عرفان

نسائی جذبات واحساسات کی ترجمان

انجنا سنگھ سینگر

صداقت کا شجاعت کا میں جھنڈا لے کے چلتی ہوں
الہٰ بادی ہوں سانسوں میں میں گنگا لے کے چلتی ہوں
وطن سے پیار کرنے کا مرا جذبہ نرالا ہے
میں اپنے دل کی دھڑکن میں ترنگا لے کے چلتی ہوں

یہ قطعہ تعارف ہے گنگا جمنی تہذیب کی شاعرہ ڈاکٹر انجنا سنگھ سینگر کا۔ الہٰ آباد ایک مردم خیز سرزمین ہے۔ یہ صوفیانہ خانقاہوں اور گیان وگیان کا شہر ہے۔ تین ندیوں کا حسین سنگم گنگا جمنا سرسوتی بھی یہیں پر واقع ہیں۔ یہ سرزمین یا یہ شہر کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ سیاست ہو یا ثقافت، علم و حکمت ہو یا ادبیت ہر شعبے میں یہاں کے لوگوں نے ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب وتمدن اور ادب کی اپنی تخلیقات سے معمور کیا ہے۔ اردو اور ہندی کے ادب اور ادیب بالکل اسی طرح ہیں جیسے شیر وشکر دونوں ایک دوسرے سے مل کر ذائقہ کو اور خوش ذائقہ بنا دیتے ہیں۔ افقِ ادب پر الہ آباد کے بہت سے ستارے روشن ہیں اور نئے ستاروں کی رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔ ادب کی تمام اصناف میں یہاں دانشوروں نے طبع آزمائی کی ہے اور مثال بھی قائم کی ہے۔ ایسا ہی ایک ستارہ جو چند سالوں سے افقِ ادب پر طلوع ہوا اور اپنی گنگا جمنی تہذیب برسوں پرانی روایتوں کی پاسداری کرتے ہوئے ہندی اور اردو دونوں ہی زبانوں کے ادب میں اپنی شاعری اور اس میں چھپے احساسات وجذبات سے قارئین کو اپنی طرف متوجہ کرنے لگا۔ اس حسین اور تابناک ستارے کا نام ڈاکٹر انجنا سنگھ سینگر ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

زبان جو بھی وطن کی ہیں مجھ کو پیاری ہیں
میں دل کا درد کسی میں بیان کر جاؤں

ڈاکٹر انجنا کا پہلا شعری مجموعہ ''من کے پنکھ'' اور دوسرا مجموعہ ''جگنو کی جنگ'' ہے جو ہندی زبان میں شائع ہوئے ہیں اور ہندی ادب کی دنیا کے لیے قیمتی اثاثہ ہیں۔ مگر تیسرا مجموعہ ''اگر تم مجھ سے کہہ دیتے'' ان کی غزلوں کا اردو زبان والوں کے لیے ایک خوبصورت عطیہ ہے۔ اور مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر انجنا سنگھ سینگر کی غزل گوئی سے اردو زبان وادب کو قوت

اور ہماری گنگا جمنی تہذیب اور قومی یکجہتی کو تقویت ملے گی:

جو بھید بھاؤ بڑھائے اگر ہو بس میں مرے
میں ختم دیش سے ایسا ودھان کر جاؤں

"غزل اردو شاعری کی آبرو ہے" رشید احمد صدیقی کا یہ قول آج بھی اتنا ہی سچا اور کھرا ہے جتنا لکھتے وقت تھا۔ غزل کی عمر بھی تمام شعری اصناف سے طویل ہے۔ اردو غزل کی عظمت اور شہرت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ وہ ہر زمانے میں وقت کے ساتھ خود کو ڈھال لیتی ہے۔ بالکل اس عورت کی طرح جو عمر اور تقاضائے وقت کے مطابق خود کو ڈھال لیتی ہے۔ عورت اور غزل دونوں میں بہت سی باتیں مماثل ہیں۔ غزل بھی سراپا عشق ہے اور عورت بھی سراپا عشق ہے۔ غزل میں نزاکت ہے، جمالیات ہے، احساسات ہے، اور عورت حسن ونزاکت، جمالیات اور احساسات کا مجموعہ ہے۔ بلکہ یوں کہیں کہ غزل صنفِ نازک کا پرتو ہے۔ آج کی نئی نسل غزلوں کی نزاکت، جمالیات اور احساسات سے دور ہوتی جارہی ہے۔ کیوں کہ انسان کا وہ ادبی ذوق ختم ہو رہا ہے۔ آج مشینوں کا دور ہے، انٹرنیٹ کا دور ہے، کتابوں سے دوستی ختم ہو رہی ہے۔ دنیا میڈیکل، انجینئرنگ اور سائنس کی طرف بھاگی جارہی ہے۔ ایسے میں جب کوئی غزل لکھتا ہے اور وہ بھی اردو زبان میں تو دل میں یہ امید جاگتی ہے کہ اب بھی زبان وادب کے وارث زندہ ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ آٹے میں نمک کے برابر ہیں مگر تخلیق کوئی آسان عمل نہیں وہ تو خداداد صلاحیت ہے اور اللہ سب کو حساس دل اور بیدار ذہن عطا نہیں کرتا۔ وہ خوش نصیب لوگ ہوتے ہیں جو قلم کاغذ کے دوست ہوتے ہیں۔

غزل بھی اب صرف حسن وعشق کا سرچشمہ نہیں رہی اس میں نسوانیت کا درد بھی ہے۔ خواہشوں کی زندہ تصویریں بھی ہیں۔ محبوب کے کوچے سے ہوتے ہوئے غزل شادی شدہ زندگی کے دکھ سکھ، گھریلو مسائل اور اپنے عہد کے مسائل تک رسائی حاصل کر چکی ہے۔ عورت صرف پیار ہی نہیں احتجاج کی طرف بھی گامزن ہے اور وطن پرستی میں بھی پیش پیش ہے۔

غزل جو ایران وعرب سے ایک روایتی لباس رمز و کنایہ اور استعارات کے زیورات اور حسنِ نزاکت سے آئی تھی۔ وہ ہندوستان کی تہذیب میں رچ بس چکی ہے یہاں کے موسموں، پرندوں، انسانوں اور ان سے جڑے مسائل کو اپنا چکی ہے اور غزل نے یہ قبول کر لیا ہے کہ

"اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا"

ڈاکٹر انجنا سنگھ سینگر کا یہ تازہ مجموعہ "اگر تُم مجھ سے کہہ دیتے" شعر و سخن کا ایک خوبصورت گلدستہ ہے۔ اس مجموعہ میں خوبصورت غزلوں کے حسین گل بھی ہیں، نظموں کے شگفتہ اور ہمہ رنگ پھول بھی ہیں اور قطعات کی سیرت اس گلدستہ کو نکھارنے کے لیے خش وخاش بھی ہیں۔

محبت کا گلہ شکوہ زمانے سے کیا تُم نے
اگر تُم مجھ سے کہہ دیتے نہ دل اتنا دکھا ہوتا

شاعرہ کے مجموعہ کا عنوان اسی شعر کا ایک ٹکڑا ہے۔ شاعرہ نے شکوۂ جاناں کو شکوۂ دوراں بنانے اور گلے شکوؤں کی تشہیر سے جو دکھ کسی انسان کو پہنچتا ہے تو اس سے مندرجہ بالا شعر کی تخلیق ہوتی ہے۔

ڈاکٹر انجنا کی شاعری میں غزل کے ناز وانداز بھی ہیں اور داخلی و خارجی دونوں پہلوؤں سے وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتی ہیں۔ آج کی غزل زندگی کے ہمہ رنگ اور آہنگ کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔

رقم تھی جس میں محبت کی داستاں ہمدم
کسی دراز میں ہم وہ کتاب ڈھونڈیں گے

اس شعر میں بدلتے ہوئے حالات، جذبات و احساسات اور کتابوں سے فاصلے کی تاریخ رقم ہے۔ واقعی یہ ایک بہترین شعر ہے۔ پہلے محبتوں کے گلاب، کتابوں میں ملا کرتے تھے اور اب وہ کتاب درازوں میں گم ہوگئی ہے۔

غزل اپنے ریشمی اور نازک دھاگوں میں زندگی کے تمام حسین موتیوں کو پرو دیتی ہے اور محبت وہ نایاب موتی ہے جس کی آب وتاب آج تک برقرار ہے۔ محبت کی جمالیات آج بھی اتنی تابناک ہے جس کی ضیا چاند تاروں کو بھی ماند کردیتی ہے۔

جو نظر میں تیری سرور تھا وہ غزل میں میری اتر گیا
مرے حسن کا یہ کمال ہے جسے دیکھ تو بھی نکھر گیا

جو نظر سے تیری نظر ملی مرے دل پہ ایسا اثر ہوا
ترے رنگ سے میں نکھر گئی مرے رنگ سے تو سنور گیا

ان اشعار میں نظر سے نظر کا ملنا حسن کا نکھرنا اور عشق کا سنورنا خوبصورت جذبات واحساسات اور جمالیات کے حسین منظر اور محبتوں کا وصال اور جمالِ یار سب کچھ ہے۔ ان کے اشعار فراق گورکھپوری کے جمالیاتی اشعار کی یاد دلاتے ہیں۔

ڈاکٹر انجنا کی غزلیں گل، بلبل، اور حسن وعشق تک محدود نہیں ہیں بلکہ آپ کی غزلوں میں انسانیت کا درد بھی ہے۔ ملک وقوم سے محبت بھی ہے۔ ان تمام احساسات کو ڈاکٹر انجنا نے غزل کا جامہ پہنا دیا ہے۔ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

فضا میں نفرتوں کی بھر گئی بارود جب سے
بہار آئی مگر پت جھڑ کا پھر بھی سلسلہ ہے

نفرتیں ختم کرو آؤ چلو اے لوگو
ملک کو پیار محبت سے سنوارا جائے

مادرِ ہند کو مل جل کے نکھارا جائے
دیش کا قرض جو ہم پر ہے اتارا جائے

انجنا کی شاعری پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم کی عورت خواہ وہ اسلام یا غیر اسلام ہندی کی ہو یا اردو کی، انگلستان کی ہو یا جاپان کی وہ صرف خوابوں میں جینا نہیں چاہتی وہ حقیقت بن کر دنیا کے سامنے آرہی ہے کیفی کی وہ عورت جسے کیفی نے کہا تھا 'اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے'۔ وہ عورت چل پڑی اپنے سماج کے شانہ بہ شانہ وہ عورت ہر گام پر مرد کی ہم سفر بن چکی ہے۔ وہ صرف حسن کا مجسمہ بن کر رہنا نہیں چاہتی بلکہ دنیا کو بتانا چاہتی ہے کہ میں شاعری کے بت کدوں سے نکل آئی ہوں اور میرا حقیقت میں ایک وجود ہے اس وجود میں دھڑکتا ہوا دل ہے اور اس دل میں صدیوں سے بند بہت سے جذبات اور احساسات کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے۔ آج کی عورت یہ بتانا چاہتی ہے کہ وہ صرف شبنم نہیں شعلہ بھی ہے۔ وہ صرف جذبوں کی کھنک اور پائل کی جھنکار نہیں وقت پڑنے پر وہ شمشیر بے نیام بھی ہے۔ وہ خاموش محبت بھی ہے اور صدائے احتجاج بھی۔ ڈاکٹر انجنا دنیا کی تمام خواتین کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کا الفاظ برتنے کا سلیقہ بھی کمال کا ہے۔

یہ میری بدنصیبی ہے کہ سارے خواب آنکھوں کے
حقیقت میں بدل جانے سے پہلے ٹوٹ جاتے ہیں

برستے ہیں جہاں پر انجنا سنگِ جہاں ہر سو
وہاں شیشے کی صورت دل بھی اکثر ٹوٹ جاتے ہیں

یہ اشعار عورت کے جذبات، اس کے حالات، اور اس پر ستم ظریفیوں کی صد فی صد صداقت کی تصویر ہے بلکہ حق بیانی اور مضمون آفرینی کا بہتر نمونہ ہیں۔ جو شعر دل پر اثر انداز ہو جائے وہ بہترین شاعری ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے باعثِ تکمیل ہیں۔ اسی لیے انجنا صاحبہ

ارتباط اور باہمی اور آپسی تعلق کو بہت اہمیت دیتی ہیں۔ کوئی کسی سے مقدم یا اہم نہیں دونوں ایک دوسرے کی ضرورت اور اہمیت ہیں۔

تجھے خود پہ اتنا غرور کیوں مری چاہتوں کا سبب ہے یہ
تو بکھرنے والا تھا ٹوٹ کر مرا ساتھ پاکے سنور گیا

انجنا کی شاعری میں عورت ماں، بیوی، محبوبہ، دلہن، بیٹی سبھی شکلوں میں نظر آتی ہے۔ اور ہر رشتے کے تقاضے کو پورا کرتی دکھائی دیتی ہے:

سکھاتی ہے ہنر دنیا میں رہ کر دنیاداری کے
وہی ماں ہے جو قسمت میں مری جنت لکھاتی ہے
وہ جب بھی سرمئی آنچل کو اوڑھے شام آتی ہے
مرے محبوب دل کی آرزو تم کو بلاتی ہے

اکیلا خود کو مت سمجھو تمہارے ساتھ میں بھی ہوں
کبھی مت آندھیوں کے سامنے گردن جھکانا تم

''اگر تم مجھ سے کہہ دیتے'' مجموعہ کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ڈاکٹر انجنا سنگھ سینگر عہدِ حاضر کے انفرادی لب ولہجہ والی ایک معتبر شاعرہ ہیں۔ زبان بھی صاف اور شستہ ہے لہجہ میں شیرینی بھی ہے اور متانت بھی۔ وہ عورت کی ہستی کو پہچانتی ہیں اور اپنی ہستی سے بخوبی آگاہ ہیں۔ وہ ایک حساس اور بیدار شاعرہ ہیں۔ وہ رشتوں کی نازک ڈوری کو بڑے سلیقے سے تھامے ہوئے چلتی ہیں اور رشتوں کی عظمت کو پہچانتی ہیں۔ وہ روایت کی پاسدار بھی ہیں اور شعری آہنگ کی روایت کو بھی بچا کر رکھتی ہیں۔ دراصل شاعرہ انسانی جذبات کی عکاسی کرتی ہیں اور ان جذبات کو شعر کے قالب میں ڈھالنے کے لیے جس نرم وملائم اور شیریں زبان والفاظ کی ضرورت ہوتی ہے انجنا صاحبہ اس سے بخوبی واقف ہیں۔ مندرجہ ذیل شعر ان کے تفکرات، تخیلات اور خوبصورت جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔

مری جستجو مری آرزو تری سادگی پہ بکھر گئی
میں خدا کی شکر گزار ہوں مری راہ تجھ پہ ٹھہر گئی

غزل میں جو آوارگی کا ماحول تھا وہ آہستہ آہستہ ٹھہراؤ کی طرف آرہا ہے۔ عورت جو خود حسن کا پیکر ہو نازک اندام ہو اس کی شاعری میں نازک خیالی، حسن عشق اور عشق ومحبت کے آفاقی جذبات واحساسات نہ ہوں یہ کیسے ممکن ہے۔ شاعرہ دردِ الفت، صحت و رفاقت، ہجر و وصال، خوشی و انبساط سبھی کیفیتوں سے بہرہ ور ہیں اور ہر طرح کے حالات سے مقابلہ کرنے کی ہمت اور حوصلہ رکھتی ہیں۔ کبھی کبھی بدنصیبی کا گلہ بھی کرتی ہیں۔ دراصل شاعری ایک ایسا عمل ہے جس میں فنکار کا دل جذبات اور احساسات سے معمور ہوتا ہے۔ وہ زندگی کے ہر لمحہ کو محسوس کرتا ہے اور زندگی کی ہر چھوٹی بڑی بات سے متاثر ہوتا ہے۔ انجنا ایک سچی شاعرہ ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ اردو زبان کو اور بھی خوبصورت مجموعے عطا کریں گی۔ یہ اردو زبان کی شیرینی ہے کہ ہندی زبان والوں کو بھی اپنی چاشنی میں ڈبو دیتی ہے۔ یہ اردو زبان کا حسن ہے کہ وہ اپنی شیرینی اور اپنے حسن کی بدولت غیر اردو داں طبقہ کو بھی اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔

□□□

Dr. Kahkashan Irfan
Assistant Professor,
Dept. of Urdu
Dr. Rizvi P.G. Degree College
Karari
Kaushambi-212206 (U.P)

سہ ماہی 'فکر وتحقیق' قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا علمی وتحقیقی جریدہ ہے۔ اس کا ارتکاز تحقیقی موضوعات اور مباحث پر ہے۔ اس میں کلاسیکی ادب، عالمی ادبیات، معاصر ادبی تحریکات ورجحانات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ علمی اور ادبی حلقوں میں یہ مجلّہ قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

سہ ماہی 'فکر وتحقیق' جولائی-ستمبر 2020 کے مشمولات کی جھلکیاں:

- پیم نیم: سولھویں صدی کی ایک غیر مطبوعہ بیجاپوری مثنوی / ارشد مسعود ہاشمی
- کلام شبلی کے اعلام واشخاص / محمد الیاس الاعظمی
- زاہدہ زیدی کی نظم گوئی: نئے آفاق کی تلاش / شاذیہ عمیر
- اردو میں ہندو مذہبی صحیفوں کی کتابیات / حیدر علی
- زیب غوری: فطرت کا مغنی ومصور / رضی شہاب
- سائبر عہد میں فروغ اردو کے امکانات / مظہر حسنین
- غالب کے سفرِ کلکتہ سے متعلق مواد کا تنقیدی جائزہ / محمد شفیق

قیمت: فی شمارہ 25 روپے

زرسالانہ: عام ڈاک سے 100 روپے، رجسٹر ڈاک سے 200 روپے

—رابطہ—

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

ڈاکٹر رخسانہ جمیل

ڈاکٹر قیام نیر کا تخلیقی عمل

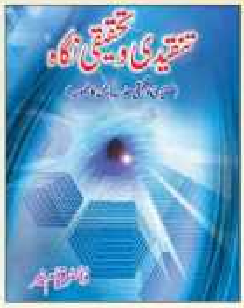

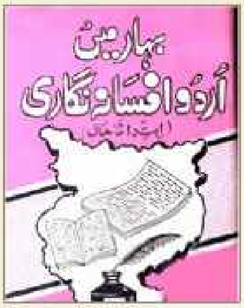

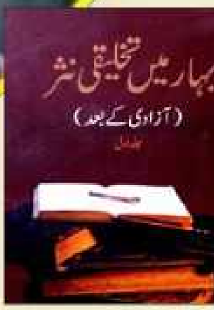

ڈاکٹر قیام نیر پچھلے چالیس برسوں سے اردو زبان وادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کے سروکاروں میں افسانہ، ناول، انشائیہ اور تحقیق وتنقید کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز 1974 میں افسانہ نگاری سے ہوا۔ اب تک ان کے دوسو سے زیادہ افسانے، کم و بیش پچاس انشائیے اور بہت سے تحقیقی وتنقیدی مضامین ملک کے مختلف معیاری رسائل میں شائع ہوچکے ہیں۔ بہت سے افسانے آل انڈیا ریڈیو دربھنگہ اور پٹنہ سے براڈ کاسٹ ہوچکے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''تنہائی کا کرب'' 1984 میں اردو ادب کے افق پر نمودار ہوا، اس کے بعد 1992 میں ان کے انشائیوں کا مجموعہ ''میری جو شامت آئی'' نے دستک دی اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ایک سال بعد 1993 میں ان کا ناول ''بچھڑی دلہن'' ادبی منظر نامہ پر لطافتیں لے کر وارد ہوا۔ فکر وفن کا یہ سلسلہ جاری رہا اور 1995 میں ان کی ایک ضخیم کتاب ''بہار میں اردو افسانہ نگاری: ابتدا تا حال'' (تنقید وتحقیق) منظر عام پر آکر تاریخ رقم کر گئی۔ پانچ سال کے توقف کے بعد 2000 میں ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''تحفہ'' شائع ہوا۔ 2014 میں ان کی ایک اہم تحقیقی وتنقیدی کتاب ''بہار میں تخلیقی نثر'' (دو جلدوں پر مشتمل) منظر عام پر آئی اور 2015 میں افسانوں کا تیسرا مجموعہ ''دھند'' ہم لوگوں کے سامنے ہے۔ ان کے علاوہ تنقیدی و تحقیقی مضامین کا ایک مجموعہ ''تحقیق وتنقید'' انشائیوں کا ایک مجموعہ ''قصہ پروفیسری کا'' اور افسانوں کا ایک مجموعہ ''احساس پارینہ'' یہ تینوں کتابیں جلد ہی منظر عام پر آنے والی ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ ''بہار اسکول'' کے تعلق سے کئی جلدوں پر مشتمل ایک اہم ترین کتاب ''بہار و جھارکھنڈ میں اردو افسانہ اور افسانہ نگار'' بھی زیرِ طبع ہے۔

اردو ادب میں بطور خاص اردو نثر نگاری میں ''بہار اسکول'' کے تعلق سے ڈاکٹر قیام نیر صاحب کی خدمات سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ انھیں اپنے ہم عصروں میں بہار اسکول کے ماہر کے طور پر شمار کیا جانے لگا ہے۔ ''بہار میں اردو افسانہ نگاری۔ ابتدا تا حال'' اور ''بہار میں تخلیقی نثر'' ڈاکٹر قیام نیر کا ایک بڑا تحقیقی اور علمی کارنامہ ہے۔ ''بہار میں تخلیقی نثر'' میں تخلیقی نثر کے چار اہم اصناف اردو ناول، اردو افسانہ، اردو انشائیہ اور اردو ڈراما پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ ڈاکٹر قیام نیر نے ان چاروں اصناف پر گفتگو کرتے ہوئے پورے وثوق کے ساتھ یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ بہار علمی وادبی دنیا میں کسی صوبے سے پیچھے نہیں رہا ہے۔ اس سلسلے میں عبدالمتین قاسمی فرماتے ہیں:

> ''انھیں اس بات کا شدت سے احساس ہے کہ اردو ادب کے تاریخ نگاروں اور تذکرہ نویسوں نے بہار سے تعلق رکھنے والے بیشتر فنکاروں کو یا تو نظر انداز کیا ہے یا انھیں وہ جگہ نہیں دی گئی جس کے وہ بجا طور پر حقدار ہیں اور جن کی ادبی

خدمات کسی بھی زاویہ سے کمتر نہیں آنکی جاسکتی ہے۔ موصوف نے اس کا اظہار بھی بڑی متانت اور سنجیدگی سے کیا ہے۔''

(عبدالمتین قاسمی۔ سہ ماہی ''دربھنگہ ٹائمس'' دربھنگہ۔ جنوری تا مارچ، 2015 ص 196)

''بہار میں تخلیقی نثر'' کی پہلی جلد میں جن افسانہ نگاروں کو جگہ دی گئی ہے ان میں ''پروفیسر اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، شین مظفر پوری، سید محمد محسن، غیاث احمد گدی، ذکی انور، انور عظیم، احمد یوسف، کلام حیدری، شمیم سیفی، شفیع جاوید، الیاس احمد گدی، ظفر اوگانوی، شفیع مشہدی، م۔ق۔ خان، شاکر کریمی، عظیم اقبال، شفق، انیس رفیع، رضوان احمد، عبید قمر، شموئل احمد، حسین الحق، شوکت حیات، قیام نیر، مشتاق احمد نوری، عبدالصمد، غضنفر، سید احمد قادری، فخر الدین عارفی، رفیع حیدر انجم، پیغام فاروقی، قاسم خورشید، مشرف عالم ذوقی، احمد صغیر وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

مصنف نے خواتین افسانہ نگاروں کی بھی ایک الگ فہرست ترتیب دی ہے اور ان کے افسانوں پر روشنی ڈالی ہے۔ چند اہم خواتین افسانہ نگار جن کو اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

''شکیلہ اختر، اعجاز شاہین، امتیاز فاطمی، عصمت آراء، کہکشاں انجم، شیریں نیازی، قمر جہاں، نصرت آرا، شمیم افزا قمر، شمیم صادقہ، صبوحی طارق، اشرف جہاں، کہکشاں پروین، نسرین ترنم، ذکیہ مشہدی، تبسم فاطمہ اور نسرین بانو وغیرہ۔

اس کتاب میں جن ناول نگاروں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں ''اختر اورینوی، شین مظفر پوری، شفق، عبدالصمد، پیغام آفاقی، حسین الحق، غضنفر، الیاس احمد گدی، مشرف عالم ذوقی، شموئل احمد، قیام نیر، شبر امام، کوثر مظہری، آچاریہ شوکت خلیل اور دیگر ناول نگاروں کا تعارف پیش کیا ہے اور ان کے ناولوں کا تذکرہ بھی کیا ہے، نیز تمام ناول نگاروں کے فن، ذہن اور ان کے تخلیقی رجحان سے بحث کی ہے۔

اس طرح جلد اول میں ناول اور افسانے کے لیے 432 صفحات مختص کئے گئے ہیں۔ جلد دوم میں پہلا باب اردو انشائیوں کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ اس باب میں بہار کے اہم انشائیہ نگاروں کو شامل کیا گیا ہے۔ جو اس طرح ہیں:

''انجم مانپوری، سید اکبر علی قاصد، حسنین عظیم آبادی، ماہ منیر خاں، ہاشم عظیم آبادی، احمد جمال پاشا، شین مظفر پوری، نعمان ہاشمی، تاج انور، تمنا مظفر پوری، ایم کمال الدین، قیام نیر، اعجاز علی ارشد، سرور جمال، ظفر چکدینوی، شبر امام، مناظر عاشق ہرگانوی اور کوثر اعظم وغیرہ۔''

مصنف نے انشائیے کے لیے تقریباً ایک سو صفحات مختص کیے ہیں۔ جلد دوم میں دوسرا باب اردو ڈرامہ نگاری کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ جن اہم تخلیق کاروں کو بحیثیت ڈرامہ نگار، زیر نظر کتاب میں جگہ دی گئی ہے ان میں چند کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

''سہیل عظیم آبادی، شین مظفر پوری، ذکی انور، سید محمد حسنین، اشرف قادری، طارق جمیلی، نعمان ہاشمی، شفیع مشہدی، عظیم اقبال، نوید ہاشمی، اکبر رضا جمشید، مناظر عاشق ہرگانوی، شبع الحق، قمر التوحید، شمیم افزا قمر اور رخسانہ صدیقی وغیرہ۔''

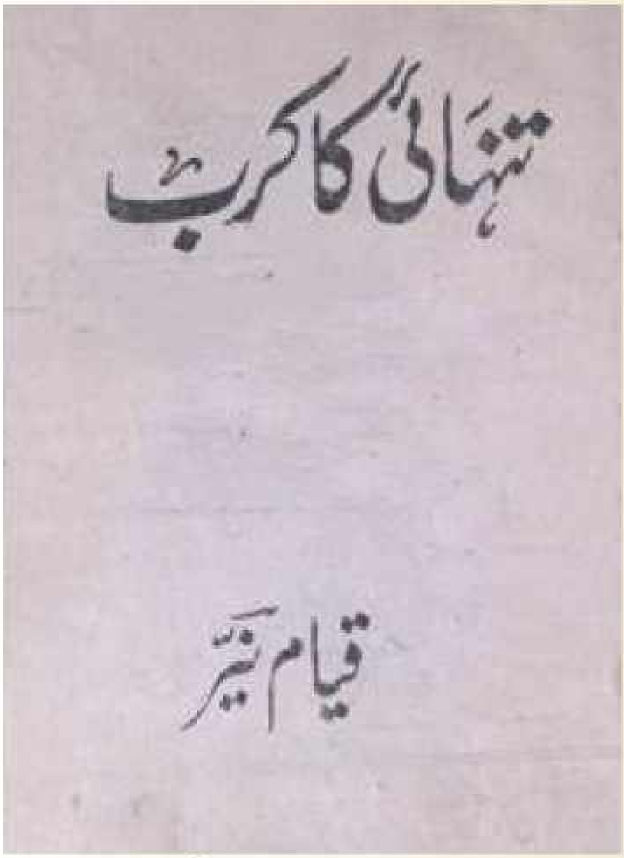

ان ڈرامہ نگاروں کے علاوہ مصنف نے کچھ اور ڈرامہ نگار کے عنوان سے چودہ ڈرامہ نگاروں کو کتاب میں شامل کیا ہے۔ کتاب دوسری جلد کا تیسرا اور آخری حصہ تمام مصنفوں کے سوانحی خاکوں کے لیے وقف کیا گیا ہے، جس میں کل ایک سو تین تخلیق کاروں کے سوانحی خاکے شائع کئے گئے ہیں۔

ڈاکٹر قیام نیر کی یہ کتاب ''بہار میں تخلیقی نثر'' (دو جلدوں پر مشتمل) بہار اسکول کے لیے ایک بے حد اہم کتاب ہے۔ اس کے متعلق فخر الدین عارفی فرماتے ہیں:

''تمام باتوں کا اگر ایمانداری سے جائزہ لیا جائے تو یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ بہار کے تخلیقی نثر پر اتنی عمدہ،

معلوماتی اور مفید کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی تھی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کتاب کو بہار کی تمام یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل کیا جائے تاکہ نئی نسل بہار کے تخلیقی نثر کے قیمتی سرمائے سے واقف ہو سکے۔"

(ماہنامہ "زبان وادب" پٹنہ، اگست، 2015، ص:68)

اسی طرح ڈاکٹر منور حسن نے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ لگاتے ہوئے اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

"ڈاکٹر قیام نیر جو خود بھی ایک ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں، انھوں نے خود بھی اس فن پر اپنی کامل دستگاہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہار میں تخلیقی نثر کو سنوارا اور سجایا ہے۔
اس کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں بہار کے اردو ناولوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ بھی قابل قدر بات ہے کہ بہار کے دو ناولوں کو ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا جاچکا ہے جن میں ایک "فائر ایریا" ہے اور دوسرا "دو گز زمین" ہے۔ ان کے علاوہ بھی اہل بہار نے کئی ایسے ناول لکھے ہیں جنھوں نے کافی شہرت پائی ہے۔"

(ڈاکٹر منور حسن کمال، ماہنامہ "ایوان اردو" دہلی، مئی 2015، ص:57)

مختصر یہ کہ ڈاکٹر قیام نیر نے بہار اسکول کے تناظر میں ایک ایسا تحقیقی وتنقیدی کارنامہ انجام دیا ہے جس کے لیے ان کا نام سنہرے حرفوں میں لکھا جائے گا۔

ڈاکٹر قیام نیر افسانہ نگار کی حیثیت سے اردو ادب میں اپنی خاص پہچان رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں سماجی، سیاسی اور اخلاقی مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔ دور حاضر میں مسلم معاشرہ جن حالات سے دوچار ہو رہا ہے اس کی عکاسی ان کے افسانوں میں خاص طور سے دیکھی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر قیام نیر نے متوسط اور نچلے طبقے کی زبوں حالی، بے بسی اور ناکامی سے پیدا ہونے والے مسائل کو بھی اپنے افسانوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہیز کے لین دین کے خلاف بھی انھوں نے آواز اٹھائی ہے۔ اخلاقی گراوٹ، اور اندھی عقیدت کو بھی انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور خلیجی ممالک میں پیدا شدہ مسائل اور بین الاقوامی صورت حال کو بھی انھوں نے قاری کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ "پیاسی آگ"، "آگ کی ٹھنڈک"، "بہار آتے آتے" اور "کانٹوں کی سیج" وغیرہ ایسے ہی افسانے ہیں:

"آپ نے سوچا تھا کہ دولت مند لڑکے سے شادی کر کے آپ نے اپنی بیٹی کے لیے سکیوریٹی خرید لی ہے۔ آپ نے اپنی بیٹی کا رشتہ طے کرتے وقت سماجی اور معاشی پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سوچا تھا کہ آپ کی بیٹی کبھی معاشی طور پر پریشان نہ ہوگی۔ کاش! آپ اپنی بیٹی کے دل کے تقاضوں کو نظر انداز نہ کرتے جسے آپ کی بیٹی نے کانچ کی طرح سنبھال سنبھال کر رکھا تھا۔ کاش آپ سمجھ سکتے کہ آپ کا چالیس سالہ داماد آپ کی جوان بیٹی کا ساتھ کیسے دے سکے گا۔ کاش آپ سمجھ سکتے کہ آپ کی بیٹی کی آرزوؤں اور تمناؤں کا گلاب کھلنے سے پہلے ہی مرجھا جائے گا۔" (پیاسی آگ)

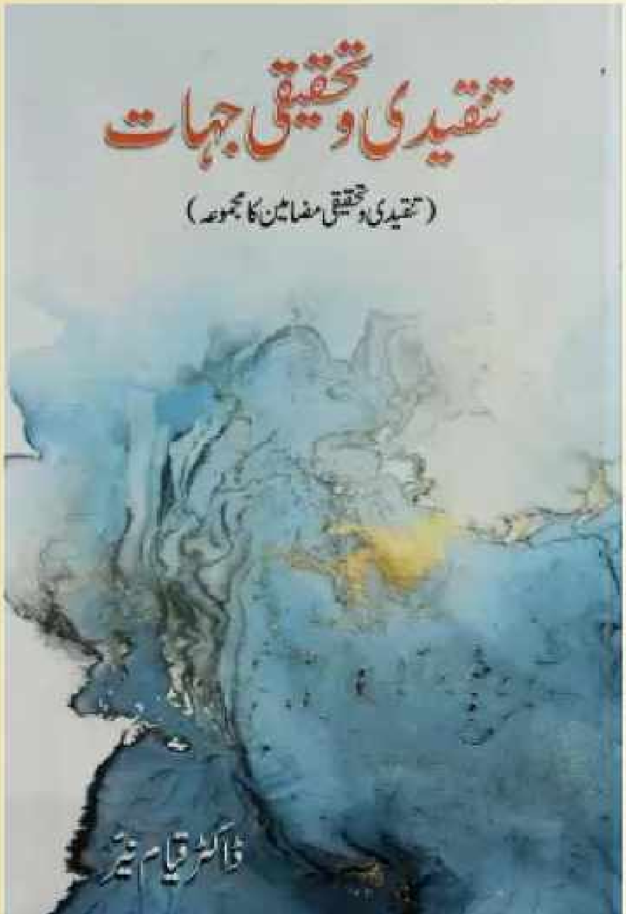

ڈاکٹر قیام نیر کے پاس مشاہدے اور تجربے کی بھی کمی نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے قرب وجوار کے ماحول کو قریب سے دیکھا ہے۔ ان میں پیدا ہونے والے مسائل کو محسوس کیا ہے۔ اس لیے ان کے افسانے خاص و عام میں مقبول ہوگئے ہیں۔ ڈاکٹر ام گوہر شگفتہ ہاشمی فرماتی ہیں:

"ڈاکٹر قیام نیر نے اپنے افسانوں میں مختلف موضوعات کو لیا ہے۔ جن کی وجہ سے ان کے افسانے رنگا رنگ ہوگئے ہیں۔ عورتوں کے مسائل، بے جوڑ شادی اور جہیز

کے لین دین جیسے بہت سے مسائل کو انھوں نے اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ ''تنہائی کا کرب''، ''گھٹن''، ''ساحل کا تھپیڑا''، ''کانٹوں کی سیج''، ''شک کی آگ''، ''بازی''، ''جہیز کی لعنت'' اور ''تحفہ'' وغیرہ ان کی ایسی کہانیاں ہیں جن میں عورت اور اس کے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ عورتوں کے زندگی میں آنے والے طرح طرح کے مسائل کو موضوع بنا کر انھوں نے جتنی کہانیاں لکھی ہیں ان میں وہ پوری طرح کامیاب ہوگئے ہیں۔ انھوں نے خلیجی ممالک میں نوکری کرنے والے لوگوں کو موضوع بنا کر کچھ کہانیاں لکھی ہیں۔ کچھ کہانیاں دیہی زندگی کو موضوع بنا کر لکھی گئی ہیں جنھیں کافی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ ایسی کہانیوں میں ''بندھن'' اور ''سمجھوتہ'' بہت اہمیت کی حامل ہیں۔''

(ڈاکٹر ام گوہر شگفتہ ہاشمی، ''سیکولر اتحاد'' پٹنہ، اپریل، 2011ص:17)

ڈاکٹر قیام نیر کے افسانوں کے پلاٹ، کردار اور مکالمے فطرت کے قریب تر ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار جاگتے اور چلتے پھرتے انسان کی طرح ہوتے ہیں۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ ڈاکٹر رئیس انور اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ''قیام نیر کے افسانوں کے موضوعات جانے بوجھے ہوتے ہیں۔ انھوں نے کھلی آنکھوں سے اپنے آس پاس کے ماحول کو دیکھا ہے اور مسائل کو محسوس کیا ہے۔ موجودہ سماج میں ضعیف لوگوں سے بیزاری، ہنگامی حالات میں آدمی کی شیطان صفتی، بنت حوا کی گونا گوں تمنائیں اور متغیر نفسیات وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن کی بعض جہتیں انھوں نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔''

(تقریظ، ڈاکٹر رئیس انور، ''تحفہ'' افسانوی مجموعہ از ڈاکٹر قیام نیر، ص:8)

چونکہ قیام نیر نے مختلف موضوعات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے اس لیے ان کے افسانے رنگا رنگ ہوگئے ہیں۔ بقول احمد صغیر:

> ''قیام نیر کو لفظوں سے کھیلنا آتا ہے۔ وہ کرداروں کی نفسیات کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کردار کا اصل چہرہ کہانی میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے موضوع پیچیدہ نہیں ہوتے۔ وہ عام زندگی سے اپنے موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔''

(اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ، احمد صغیر، ص:۲۴۰۔۲۴۱)

زبان و بیان کے لحاظ سے بھی ڈاکٹر قیام نیر کے افسانے دلکش اور دلنشیں ہیں۔ انھوں نے موقع محل کی مناسبت سے مکالمے استعمال کیے ہیں۔ سادہ اور سلیس زبان استعمال کرنے کی وجہ سے عام آدمی بھی ان کے افسانوں کو پڑھ کر لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ شاید اس لیے بیگم وسیم راشد فرماتی ہیں:

> ''قیام نیر کے کردار ہماری اور آپ کی زندگی کے چلتے پھرتے عکس ہیں۔ ان کے افسانوں میں وہ عام گھریلو فضا ہے جس میں ہم اور آپ سانس لے رہے ہیں۔''

(بیگم وسیم راشد، ماہنامہ ''ایوان اردو'' دہلی، اکتوبر 2003، ص:50)

افسانہ نگار کو اس فن پر ایک خاص ملکہ حاصل ہونا چاہیے۔ جب تک اس فن پر افسانہ نگار کی دسترس نہ ہوگی وہ کسی بھی واقعہ کو افسانے کے قالب میں نہیں ڈھال سکتا۔ ڈاکٹر قیام نیر اس فن سے اچھی طرح واقف ہیں۔ پروفیسر شہزاد انجم ان کی افسانہ نگاری کے بارے میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''قیام نیر کے افسانوں کی پہلی قرأت ہمیں چونکاتی ہے۔ ذرا دیر کو ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کیا واقعی سماج میں اس طرح کے واقعات روزمرہ زندگی میں رونما ہو رہے ہیں۔ پھر ایک وقفے کے بعد ٹھہر کر سوچتے ہیں اور اندازہ یہ ہوتا ہے کہ قیام نیر کا مشاہدہ اور ان کی نظر باریک ہے۔ وہ سماجی اتھل پتھل، تغیر و تبدل، بے حسی و ظلم و جبر کو نہ صرف دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں بلکہ انھیں اپنے افسانہ کا موضوع بھی بناتے ہیں۔ قیام نیر سماجی مسائل کی تہہ تک پہنچتے ہیں۔ جزئیات کا مشاہدہ کرتے ہیں، انسانی رشتوں کی نبض پر انگلی رکھتے ہیں۔ انسانی عادات و خصائل کے بطن میں اترنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان سب کے بعد انھیں جو کچھ حاصل ہوتا ہے اسے افسانہ کا موضوع بناتے ہیں۔''

(تقریظ، پروفیسر شہزاد انجم، قیام نیر، سال اشاعت، 2015، ص:9)

ڈاکٹر قیام نیر کے بہت سے انشائیے ملک کے معتبر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ انشائیوں کا ایک مجموعہ ''میری جو شامت آئی'' 1992 میں منظر عام پر آیا تھا۔ دوسرا مجموعہ ''قصہ پروفیسری کا'' جلد ہی منظر عام پر آنے والا ہے۔ ڈاکٹر قیام نیر انشائیہ کو اردو کی ایک مقبول صنف بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''آج انشائیہ کی بہت اہمیت ہے۔ زندگی کی پیچیدگیاں روز افزوں بڑھتی جا رہی ہیں، اور نئے نئے مسائل کوہ وسنگ بن کر حائل ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسی صورت میں انشائیہ

موجودہ دور کے تھکے، ماندے اور مصروف و مشغول انسان کے جذبات پر تیزی سے اثر انداز ہونے کے علاوہ اس کے تخیل کو عمل کا موقع بھی فراہم کر رہا ہے۔ ان میں فن کی نزاکت کے ساتھ ساتھ اختصار و ایجاز اور تصور آفرینی بھی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے بھی اس کا میدان بہت وسیع ہے۔ دنیا کی ہر چیز انشائیہ کا موضوع بن سکتی ہے۔''

(بہار میں اردو تخلیقی نثر نگاری، قیام نیر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2014، ص:78)

''میری جوشامت آئی''، ''تک تک دیدم''، ''بادل نخواستہ''، ''دیر آید'' اور ''حد پرواز'' وغیرہ ان کے اچھے انشائیے ہیں۔ انھوں نے صنف انشائیہ میں بھی اونچا مقام حاصل کرلیا ہے۔ زبان و بیان کے لحاظ سے ان کے انشائیے بہت اہم سمجھے جاتے ہیں:

''کئی دن اور کئی راتیں ہنسی خوشی سے گزر گئیں۔ ابا حضور کے دندان مبارک چوبیس گھنٹے میں کم از کم آٹھ گھنٹے کھلے ہی رہتے تھے۔ اماں کے پاؤں تو جیسے زمین پر پڑتے ہی نہ تھے ___ دماغ کے چاروں کونے روشن کردینے والی ابا کی ڈانٹ اور دل دہلا دینے والی اور آنکھوں کی پتلیاں پھیلا دینے والی اماں کی گھڑکی نہ جانے کہاں دفن ہوگئی تھی۔'' (تک تک دیدم)

امید ہے مستقبل میں ڈاکٹر قیام نیر اردو انشائیہ نگاری کے باب میں خاطر خواہ اضافہ کریں گے۔

ڈاکٹر قیام نیر کے بارے میں پہلے کہا جاچکا ہے کہ انھوں نے مختلف اصناف ادب پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا ایک ناول ''بچھڑی دلہن'' 1993 میں منظر عام پر آیا ہے۔ یہ ایک معاشرتی اور رومانی ناول ہے۔ اس میں ایک ایسی عورت کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے جس کا شوہر بے روزگاری اور اپنی ماں کے ذریعہ سسرال سے شادی کے بعد جہیز کے نام پر طرح طرح کی چیزیں اور نقدی مانگ کرلانے کی روز روز کی فرمائش سے تنگ آکر گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ اس ناول کی مرکزی کردار انجم شوہر کے چلے جانے کے بعد ساس اور نند کی سختی اور بے رحمی کی وجہ سے پریشان ہوتی ہے۔ جہیز نہ لانے کی وجہ سے اس پر طرح طرح کا الزام لگا کر اسے گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔ اس کے والدین اس دنیا سے رخصت ہوچکے تھے اس لیے چچی کے یہاں چلی جاتی ہے لیکن وہاں بھی اسے طرح طرح کی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تنگ آکر وہ خودکشی کرنا چاہتی ہے لیکن وہ اس میں بھی کامیاب نہیں ہو پاتی ہے۔ ایک عرصے کے بعد اس کا شوہر مل جاتا ہے تو اس کی ساری خوشیاں لوٹ آتی ہیں۔ اس ناول کے بارے میں اکبری خاتون فرماتی ہیں:

''یہ ناول فکری اور فنی دونوں اعتبار سے ایک بلند پایہ تخلیق ہے۔..... اس ناول کی ہیروئن انجم بھی اس مسئلے سے دوچار ہے۔ وہ خوبصورت اور تعلیم یافتہ تو ہے لیکن مالی طور پر کسی بڑے خاندان سے تعلق نہیں رکھتی ہے۔ نتیجے میں جہیز نہ لانے کی پاداش میں اس پر بدصورتی کا الزام لگا کر گھر سے نکال دیا جاتا ہے۔''

(تبصرہ اکبری خاتون۔ ماہنامہ ''مریخ'' پٹنہ، اپریل تا جولائی، 1997، ص:45)

اس ناول کا انجام طربیہ ہے۔ پیشکش کا انداز بھی دلکش ہے۔ واقعات کے اظہار اور کرداروں کی زبان صاف ستھری، سہل اور عام فہم ہے:

''سردی کے موسم میں لوگ اکثر سرشام ہی بستر پکڑ لیتے ہیں اور خاموشی سے سو جاتے ہیں لیکن حلیم الدین پر آج کچھ اور ہی نشہ طاری تھا۔ وہ الگ بیٹھے کسی گہری سوچ میں ڈوبے تھے۔ بات یہ تھی کہ جب سے انھوں نے مجیب کے لڑکے نقیب کے انتقال کی خبر سنی تھی ان کا دل نہیں چاہتا تھا کہ مصلح الدین کی شادی کہیں اور ہو۔ لیکن انھیں بڑی بھابھی کے سامنے بولنے کی ہمت نہ تھی۔''

اس ناول کے واقعات اور کرداروں کی پیشکش ایوب خاں کے مطابق:

''موضوع اگرچہ پرانا ہے تاہم جس طرح ناول نگار نے پیش کیا ہے، قابل ستائش ہے۔ اسلوب سلیس سادہ عام فہم اور دلچسپ ہے۔ قیام نیر کی اس کاوش کو نظر انداز کرنا مشکل ہے جبکہ اس صنعتی دور نے ناول جیسی صنف ادب کو متاثر کیا ہے۔''

(نقد و نظر، ایوب خاں، دوماہی ''پرواز ادب'' پنجاب، مارچ۔ اپریل۔ 1991، ص:83)

دراصل ناول میں زبان ہی ایک ایسی بنیادی قوت ہوتی ہے جس پر واقعہ نگاری، کردار نگاری اور مکالمہ نگاری کا دار و مدار ہوتا ہے۔ اس ناول کے مکالمے کرداروں کی باہمی گفتگو، عام زندگی کی گفتگو سے ملتے جلتے ہیں اس لیے یہ حقیقت کے قریب تر ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر قیام نیر ایک ایسے قلم کار ہیں جنھوں نے مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی ہے اور ہر جگہ کامیاب ہیں۔

Dr. Rukhsana Jameel
H.N. High School
Barhaita
Samastipur-848302 (Bihar)

ڈاکٹر محمد امین میر

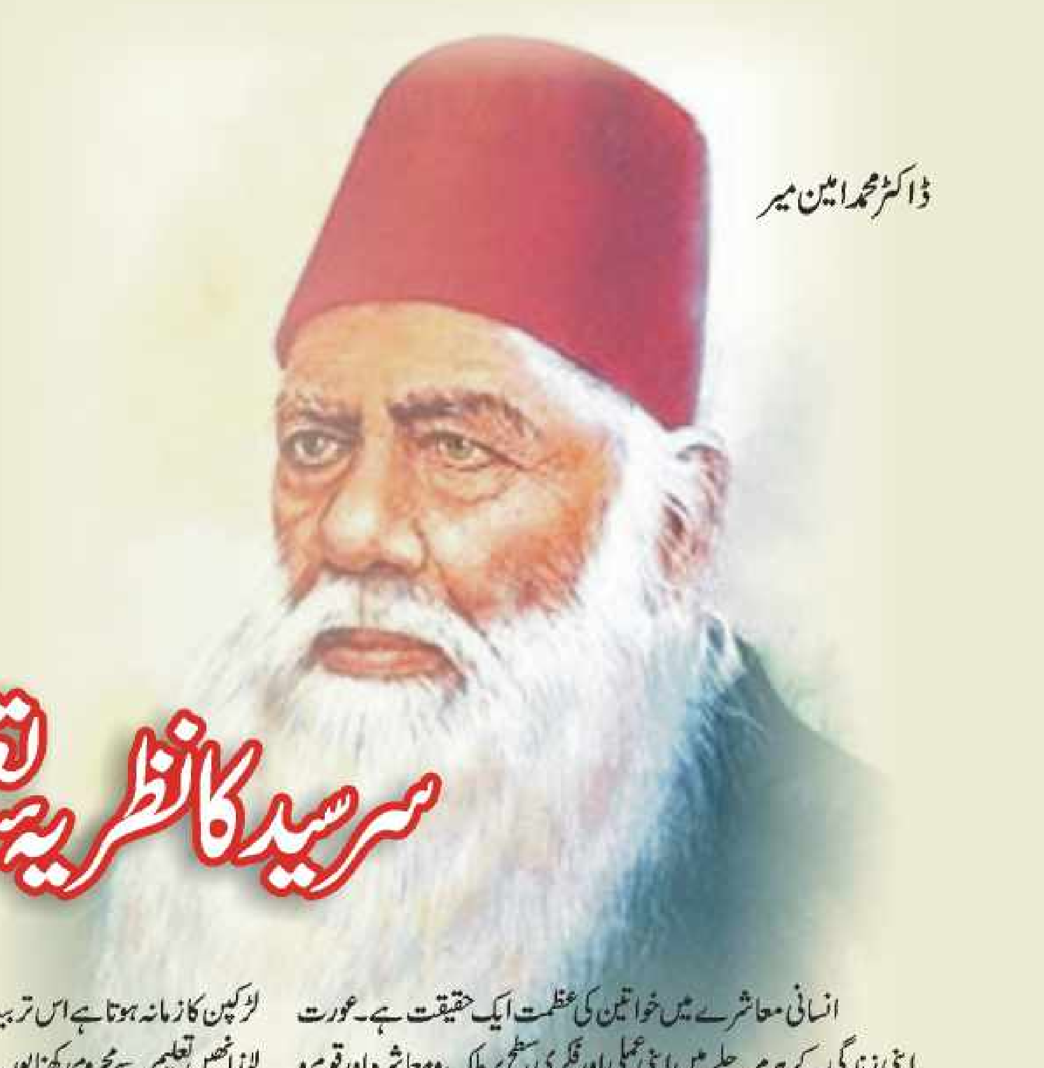

سرسید کا نظریہ تعلیم نسواں

انسانی معاشرے میں خواتین کی عظمت ایک حقیقت ہے۔ عورت اپنی زندگی کے ہر مرحلے میں اپنی عملی اور فکری سطح پر ملک ومعاشرہ اور قوم و ملت کو عظمت ورفعت کا اثاثہ فراہم کرتی ہے۔ انیسویں صدی میں سرسید نے مشرق ومغرب کی تہذیبی کشمکش میں مسلمانوں کے لیے جس دوراندیشی کا ثبوت فراہم کیا، اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ دراصل مشرق ومغرب کی تہذیبی کشمکش ہندوستانی معاشرت پر ایک طرح کی یلغار تھی، جس نے ہندوستانی عوام میں ایک بےچینی واضطراری پیدا کی تھی۔ اس سلسلے میں سرسید نے اپنے آپ کو عصری حالات وواقعات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی اور ان حالات پر غوروفکر کیا، تو انھیں محسوس ہوا کہ عصر رواں اور جدید دور کے تقاضوں اور چیلنجوں تک اگر نظر کی رسائی نہ ہوئی تو اس کے تباہ کن نتائج سے ہماری قوم بچ نہیں سکتی۔ لہٰذا تعلیم کو نئے سرے سے اس طرح حاصل کرنے کی کوشش کی جائے کہ اسلام وعقائد کے اصول، عصر جدید کے تغیرات کے ساتھ ہم آہنگ ہوں تاکہ جدید اور قدیم کی اس آمیزش سے عصر رواں کے تقاضے بھی پورے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ قوم و وطن کی فلاح وبہبودی میں سرسید تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ تعلیم کو بغیر تربیت کے ناقص سمجھتے تھے۔

قوم ووطن اور معاشرے کی فلاح وبہبودی میں عورت ومرد دونوں ہی مشترکہ اہمیت کے حامل ہیں اور تربیت کے لیے سب سے زیادہ موزوں لڑکپن کا زمانہ ہوتا ہے اس تربیت میں عورت کا بہت اہم رول ہوتا ہے۔ لہٰذا انھیں تعلیم سے محروم رکھنا پورے قوم اور معاشرے کو جاہل رکھنا ہے۔ ایسے میں سرسید احمد خاں پر یہ الزام لگانا کہ وہ تعلیم نسواں کے معاملات میں جدید خیالات والے انسان نہیں تھے سراسر غلط ہے۔ ڈاکٹر شیخ عبداللہ ایڈووکیٹ (پدما بھوشن) اپنی خودنوشت ''مشاہدات وتاثرات'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''عورتوں میں زمانہ حال کی طرز تعلیم کا کہیں نام ونشاں بھی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ سرسید احمد خاں جسے قوم کے رہنما نے بھی جدید تعلیم نسواں کی مخالفت کی اور اخیر تک مخالفت کرتے رہے۔''

(مشاہدات وتاثرات، ص:198، ڈاکٹر شیخ محمد عبداللہ ایڈووکیٹ مرحوم (پدما بھوشن) فیملی ایجوکیشن ایسوسی ایشن علی گڑھ U1206293 M.A. Library, (AMU.

> ''ادھر تو لڑکوں کی انگریزی تعلیم کے لیے یہ کوشش تھی۔ ادھر لڑکیوں کے لیے ان کے سامنے انگریزی تعلیم کا نام لینا بھی دُشوار تھا۔ میں نے جب جس موقع پر بھی سرسید کی زبان سے تعلیم کے بارے میں آواز سنی۔ اس میں لڑکیوں کے لیے انگریزی تعلیم کی مخالفت ہی سنی۔ جسے کہ ہمارے مولوی صاحبان لڑکوں کے لیے بعض انگریزی کی تعلیم کو کفر سمجھتے

تھے۔ ویسے ہی سرسید انگریزی تعلیم کو لڑکیوں کے لیے ان کی اخلاقی حالت کے لیے مضر سمجھتے تھے۔''

(ایضاً ص:199-200)

گیل مینو اور ڈیوڈ لیلی ویلڈ کے حوالے سے پروفیسر شافع قدوائی اپنے ایک مضمون ''تعلیم نسواں کا مروجہ بیانیہ اور سرسید'' میں رقمطراز ہیں:

''ان دونوں نے بھی سرسید کے اوپر یہ اعتراض کیے ہیں کہ سرسید اسلام میں عورتوں کے حقوق کو موضوع بحث بنانے کے مخالف تھے۔ اس کی دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ مولوی سید ممتاز علی کے مسودہ ''اسلام میں خواتین کے حقوق'' کو پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ ڈیوڈ لیلی ویلڈ سرسید کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''پردے کے سخت وکالت کرنے والے اور خواتین کی تعلیم کے مخالف سرسید کسی بھی طرح سے جدید خیالات والے انسان نہ تھے۔ جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں''۔

(تہذیب الاخلاق خصوصی پیش کش ۱؍فن سرسید 2017، پروفیسر شافع قدوائی/ترجمہ اسعد فیصل فاروقی)

پروفیسر شافع قدوائی کی تحقیق کے مطابق ان دونوں اور بعض دیگر معروف عالموں نے حفیظ جالندھری کی یادداشتوں پر مبنی ثبوت پر مکمل انحصار کیا ہے جو صحیح نہیں۔ سرسید کی تحریروں، اخباروں اور تقریروں کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں اور تقریریں صاف طور پر مسائلِ تعلیم نسواں کے خیالات کی عکاسی کرتی نظر آتی ہیں اور یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ تعلیم نسواں میں کتنی زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ لیکن حالات اور زمانہ ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

ان کے اخبار میں بہت سے ایسے مضامین شائع ہوئے کہ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ تعلیم نسواں کے کتنے خواہاں تھے اور انھوں نے تعلیم نسواں سے متعلق عوام میں ایک نئی آگہی پیدا کی۔

بقول شافع قدوائی:

''انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں بہت کم لڑکیاں طبی پیشہ سے وابستہ تھیں لڑکیوں کے لیے تعلیم کا منصوبہ ہندوستان میں بسر کار ایک برطانوی ڈاکٹر نے تیار کیا۔ سرسید نے اس تجویز کو خیر مقدم کیا اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اس کے بارے میں بھی لکھا...... علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے آغاز سے ہی ایسی خبریں، اداریے، ادارتی نوٹ، فیچر اور مضامین تواتر کے ساتھ شائع کیے، جو ہندوستان میں مختلف حصوں اور بیرونِ ممالک میں تعلیم نسواں کے فروغ سے متعلق ہونے والی سرگرمیوں سے متعلق تھے...... دنیا میں تعلیم نسواں کی ترقی اور اس میں آنے والی تبدیلی کے بارے میں اپنے قارئین کو باخبر رکھنے کے لیے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ نے ایک باقاعدہ نیوز کالم (Iceasioned notes) شروع کیا۔'' (ایضاً)

سرسید ایک جگہ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں :

''ہم عورتوں کی تعلیم کے باب میں بالکل متفق ہیں اور بلاشبہ عورتوں کو عمدہ تعلیم دینی چاہئیں مگر ایسے طرز تعلیم سے جس میں پردہ کی رسم میں جو ہم لوگوں کے نزدیک نہایت عمدہ ہے فتور آوے اتفاق نہیں کرتے۔

سرسید کے سفرنامہ ''مسافران لندن'' سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ خواتین کے جذبے اور ان کے مختلف موضوعات کی واقفیت اور تعلیم کے سلسلے میں ان کے کارناموں اور خوبیوں پر کتنا فخر محسوس کرتے ہیں۔ اور

ہندوستانی خواتین کے ساتھ موازنہ بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ جیسے لندن میں جس مکان پر مقیم تھے وہاں کی لیڈی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ بہت علیل تھی اور حالت بیماری میں بھی انہوں نے مجھ سے کہلا بھیجا کہ جو کتابیں تم نے حال ہی خریدی تھی۔ ان میں کوئی کتاب میرے پڑھنے اور دل بہلانے کو بھیج دوں خیر میں نے کتابیں بھیجی اور دو دن بعد انہوں نے اس کتاب پر مجھ سے اہم گفتگو کی کیا یہ تعجب انگیز بات نہیں کہ ایک عورت حالت بیماری میں کتاب پڑھنے سے دل بہلاوے آپ نے ہندوستان میں کسی امیر، کسی نواب، کسی راجہ، کسی مرد اشراف کو ایسی خصلت کا دیکھا ہے؟۔"

(مسافران لندن، ڈاکٹر سر سید احمد خان بہادر۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، (پاکستان)، جون 1996 ص:194)

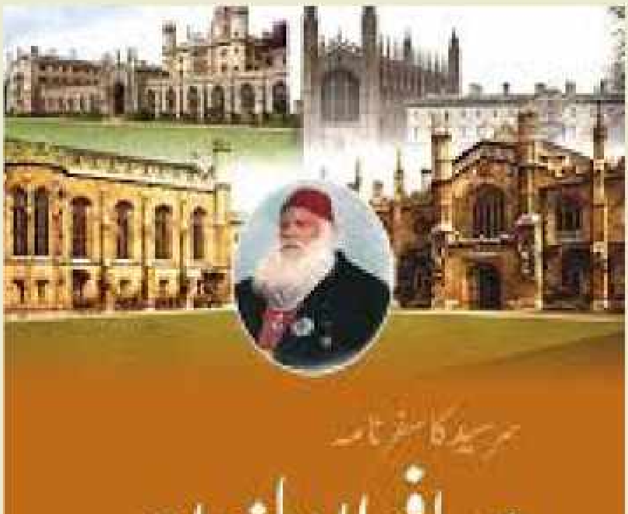

اس طرح دستانوں کی دکان پر کئی زبانوں کی ماہر ایک فرانسیسی لڑکی کے باوقار اخلاق اور گفتگو سے سر سید بہت متاثر ہوتے ہیں لکھتے ہیں کہ رات میں ہم لوگ بازار کی طرف نکلے اور ہاتھوں کے دستانے مول لینے کا ارادہ کیا۔ راستے میں ایک دوکان میں گئے۔ جہاں ایک عورت نہایت شائستہ گفتگو کرتی ہوئی پیش آئی اور اس کا اندازِ بیان دل موہ لینے والا تھا اور اس کے یہاں سے ہم نے دستانے خرید لیے۔

(تہذیب الاخلاق، ص:150۔151 ایضاً)

لندن میں مقیم اس گھر کے دو خادموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"اس نو عمر لڑکی ایلزبتھ ماتھیوز کو دیکھو باوجود قلت تنخواہ کے ہمیشہ ہاف پینی والے اخبار جس کا نام ایکو ہے مول لیتی ہے اور جب کام سے فرصت ملی تو اس کو پڑھتی ہے...... آپ یقین جانیے کہ اگر یہ عورت...... ہندوستان میں جاوے اور اچھے اچھے امیر آدمیوں سے ملے تو ان کو محض جانور سمجھے اور نہایت حقارت سے ان سے نفرت کرے یہ صرف نتیجہ عام تعلیم و تربیت کا ہے۔"

(مسافران لندن، ڈاکٹر سر سید احمد خان بہادر۔ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن (پاکستان)، جون 1996 ص:201)

مذکورہ بالا اقتباس کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوا ہوگا کہ سر سید دراصل تعلیم نسواں کے خلاف نہیں تھے بلکہ اس کے لیے ہمیشہ فکر مند رہتے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے برعکس مردوں کی جدید تعلیم پر زیادہ توجہ کیوں دیتے تھے؟ مخلوط تعلیم کا تصور قبول کیوں نہیں تھا؟ بغیر پردہ کے تعلیم کے حق میں کیوں نہیں تھے؟ خواتین کے لیے اسکولی تعلیم کو پسند کیوں نہیں کیا؟ ایک ایسی گھریلو تعلیم جہاں استانی یا مولوی صاحب تعلیم دیتے ہوں مستحسن تصور کیوں کیا اور سر سید لڑکوں کو لڑکیوں پر کیوں ترجیح دیتے تھے؟ ان تمام سوالات کو اس عہد کے پس منظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے اور ساتھ ساتھ سر سید کا جو تعلیمی تصور تھا وہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ وہ کس طرح کی تعلیم کو ترجیح دیتے تھے۔ وہ کس طرح کی جدید تعلیم کو خصوصاً مسلمانوں میں عام کرنا چاہتے تھے۔ ان چند سوالات پر کھلے دماغ اور دور اندیشی اور نگاہِ شوق کی ضرورت ہے۔ چونکہ جب ہم اس عہد کا مطالعہ کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے روبرو ایک ایسی تہذیب تھی جو وقت اور خود اعتمادی سے لبریز تھی اور جدت و نشاط انگیزی اور تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال تھی۔ اِدھر جہاں مردوں کی تعلیم کے سلسلے میں اس وقت معاشرہ جدید تعلیم کو قبول نہیں کر رہا تھا مسلمان انگریزی و سائنسی تعلیم کو منافی خیال کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ مسلمان اس تعلیم سے عیسائی بن جائیں گے خاص کر کچھ طبقے کے مسلمانوں نے اس معاملے میں کفر کے

فتویٰ بھی لگائے اوراس کے علاوہ ہندوستانی عوام روحانی اور مادی اعتبار سے کمزور ہو چکے تھے لہٰذا انھیں احساس ہوا کہ بے اعتمادی، احساس کمتری اور روحانی کمزوریوں کے ساتھ کوئی قوم زیادہ دنوں تک اپنی انفرادیت باقی نہیں رکھ سکتی ایسے ماحول میں اسے سرسید کی دور اندیشی ہی کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے مشرقی خواتین کو ممکنہ خطرہ سے محفوظ رکھا اور زیادہ مناسب یہی سمجھا کہ خواتین کو گھر پر ہی تعلیم حاصل کرنی چاہیے دراصل یہ موجودہ صورتحال کے پیچیدہ مسائل پر غوروفکر کرکے ایک اہم فیصلہ تھا۔ سرسید کا یہ خیال کہ خواتین جدید تعلیم کے ذریعہ اپنی مشرقی اقدار کی اس روایت کو نظر انداز کریں گی کسی حد تک صحیح تھا۔ کیونکہ اس وقت ہندوستانی سماج اور معاشرے کی عورتوں میں مشرقی تہذیب رچی بسی تھی (جو بدقسمتی سے آج کل ختم ہوگئی ہے۔) اس قدیم روایات میں توسیع پیدا کرنے کی صلاحیت موجود نہیں تھی تو ایسے میں ایک نئی تہذیب (جس میں مخلوط تعلیم بے پردگی یا کالج شامل تھے) قبول کرنے سے نتائج کچھ اور سامنے آتے۔ اب ”اسباب بغاوت ہند“ کے ان سطور پر غور کریں جس میں سرسید اس بدامنی کی ایک وجہ لڑکیوں کے علاحدہ اسکول یا مخلوط اسکول کا کھولنا بتاتے ہوئے لکھتے ہیں :

> ”لڑکیوں کی تعلیم کا بہت چرچا ہندستان میں تھا اور سب یقینی جانتے تھے کہ سرکار کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیاں اسکول میں آئیں اور تعلیم پائیں اور بے پردہ ہوجائیں کہ یہ بات حد سے زیادہ ہندوستان کو ناگوار تھی۔“

(رسالہ اسباب بغاوت ہند، مطبع مفیدہ عام آگرہ، 1903، ص:19)

لہٰذا اس تناظر میں ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ سرسید کا مقصد انھیں ہر خطرہ سے محفوظ رکھنا تھا اور مشرقی عورتوں کو ان کے شریفانہ اطوار جو مشرقی دل و دماغ کے ساتھ قائم ہیں برقرار بھی رکھنا تھا نہ کہ انہیں تعلیم سے محروم رکھنا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید نے مخلوط تعلیم کو پسند نہیں کیا اس کے برعکس ایسی گھریلو تعلیم جہاں استانی یا مولوی صاحب تعلیم دیتے ہوں مستحسن تصور کیا۔ جہاں پر پڑھنے لکھنے، ریاضی سیکھنے کے ساتھ ساتھ سلائی کی تربیت بھی دی جائے۔ نیز وہ تمام چیزیں جو ایک خوش حال گھریلو زندگی کے قیام کے لیے ضروری ہیں، برابر اہمیت دی۔ انھوں نے اس عہد میں ایک قافلہ کی منصوبہ بندی کی اور یہ ایسا قافلہ جو اپنے ساتھ تہذیب وتمدن، علم وفن زندگی کا فلسفہ، معاشرت واجتماع، ذہنی نشوونما اور افکار واقدار سے لبریز ہو جو آگے چل کر اپنی عورتوں کی عزت کرنا اور اپنی بیٹیوں کی اچھی تربیت کرنا سکھائے گا دراصل سرسید تعلیم کو ثقافت، اخلاقیات، اخلاقی اقدار، تہذیب اور علم الٰہی کا سرچشمہ سمجھتے تھے۔

> ”جب مرد تہذیب وتربیت کے درجہ معین پر پہنچ جاویں تو وہ اپنی عورتوں کو خود سعی وکوشش کرکے شائستگی میں اپنے برابر کرلیں گے۔“ (تہذیب الاخلاق)

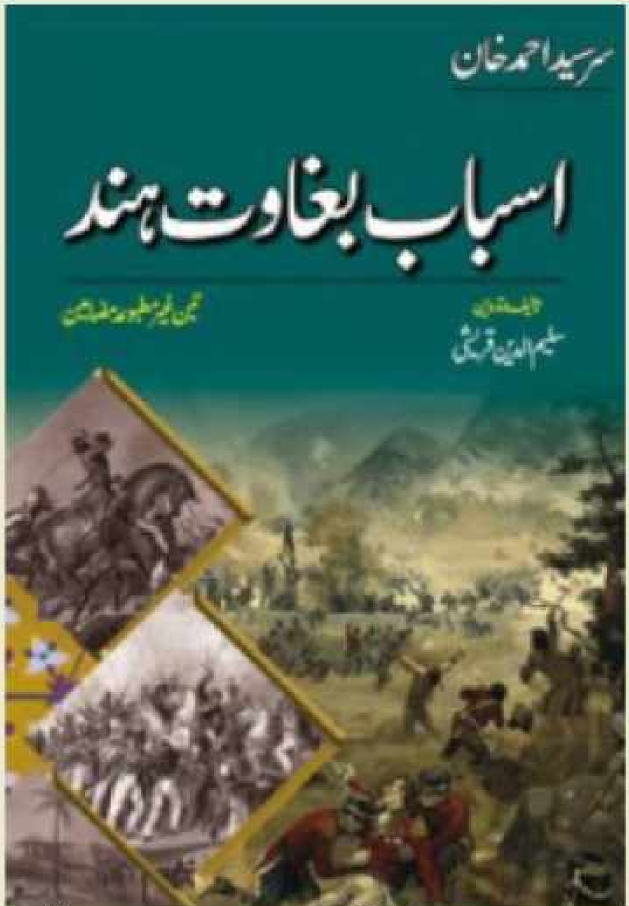

اس سفر کو بھی ذہن میں رکھیں جو انھوں نے 1884 میں اپنے تعلیمی و اصلاحی فروغ اور کالج کی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے کیا تھا اور وہاں پر ان کے استقبال کے لیے پنجاب کے معزز خاندان کی پردہ نشیں خواتین نے سرسید کو اپنے کلمات سے مخاطب کیا تھا۔ سید اقبال علی کے مطابق سرسید نے اس ایڈریس کی کاپی طلب کی جس میں لکھا تھا:

> ”اے خداوہ زمانہ تھا کہ خاتونان عرب وھند اپنے گھر کے مردوں کو قومی ترقی اور تعلیم کے معاملات میں اس قدر حوصلہ اور ہمدردی ظاہر کرتی تھی۔ آج ہم، جو انہی کی اولاد ہیں ایک بزرگ محسن قوم کے شکریہ کے لیے چند موزوں الفاظ بھی نہیں سوچ سکیں۔“

(سرسید احمد کا سفرنامۂ پنجاب، از مولوی سید اقبال علی مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، ص: 140 گلی عزیزالدین وکیل، ڈاکٹر مرزا احمد علی مارگ)

سرسید پر اس کلمات کا اتنا اثر ہوا اس کا اندازہ آپ انھیں کے الفاظ سے لگایا جاسکتا ہے :

"آج کی رات میرے لیے شب قدر سے کچھ کم قدر کی نہیں جو ایڈریس تمہاری طرف سے مجھ کو دی گئی، وہ میرے لیے ایک ایسی عزت ہے جو آج تک ہندوستان میں کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ میں تمہاری اس شفقت کا دل سے شکرگذار ہوں۔" (ایضاً،ص:141-142)

"اے میری بہنو! میں اپنی قوم کی خاتونوں کی تعلیم سے بے پروا نہیں ہوں۔ میں دل سے ان کی ترقی تعلیم کا خواہاں ہوں۔ مجھ کو جہاں تک مخالفت ہے اس طریقۂ تعلیم سے ہے۔ جس کے اختیار کرنے پر اس زمانے کے کوتاہ اندیش مایل ہے میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ تم اپنا پرانا طریقۂ تعلیم اختیار کرنے پر کوشش کرو وہی طریقہ تمہارے لیے دین و دنیا میں بھلائی کا کفیل دے گا اور کانٹوں پر پڑنے سے محفوظ رکھے گا۔"

(ایضاً،ص:142)

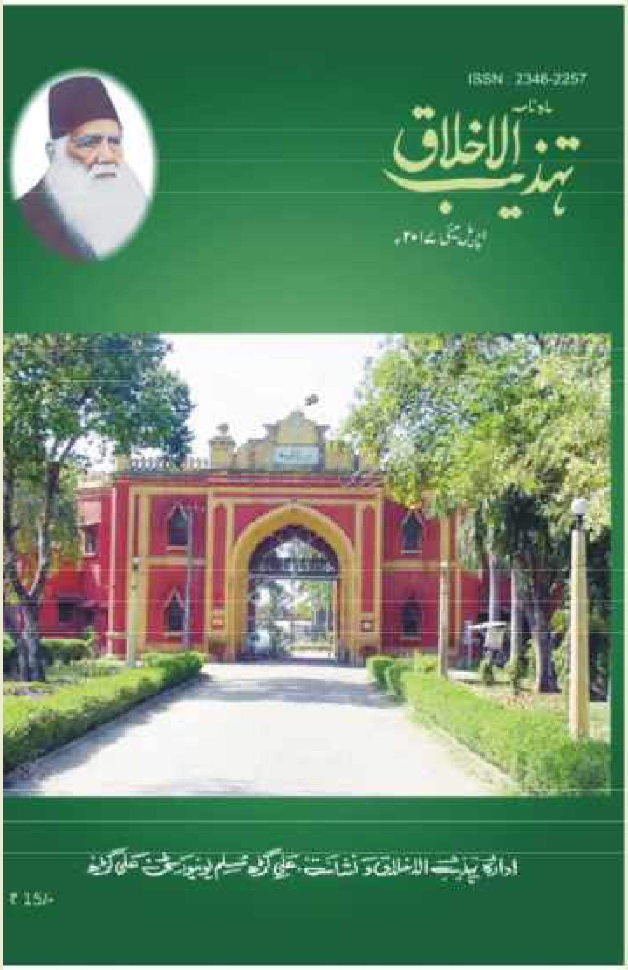

"لڑکوں کی تعلیم پر جو کوشش کی ہے اسے تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں، بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔ پس جو خدمت میں تمہارے لڑکوں کے لیے کرتا ہوں درحقیقت وہ لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے لیے ہے۔" ایضاً،ص:144

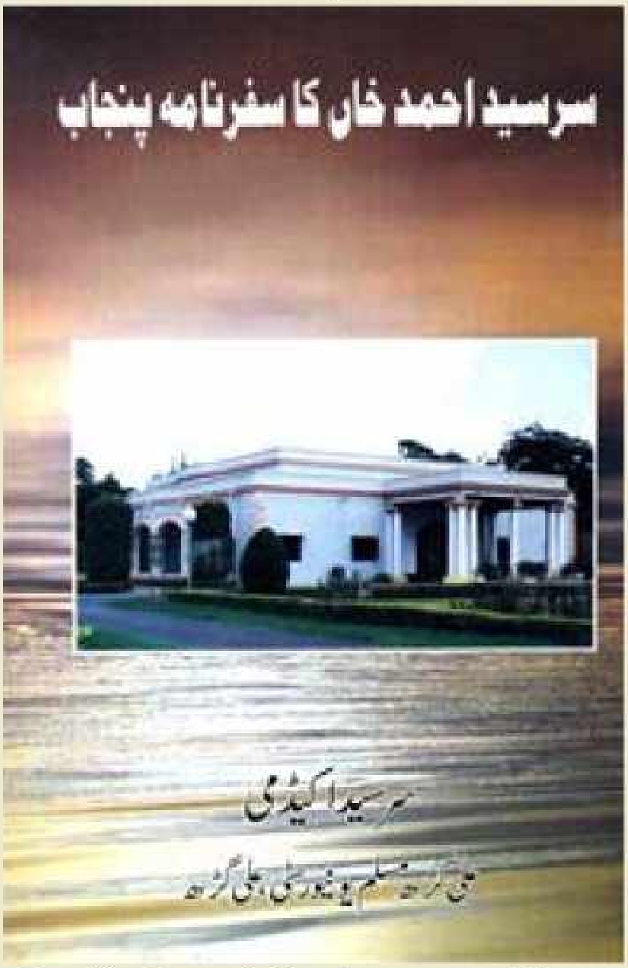

غرض سرسید پر یہ اعتراض عائد کرنا کہ سرسید کے دلائل ان کے انقلابی لبرل نظریہ (جس کو انھوں نے اپنی قرآن کی تفسیر اور دیگر تحریروں میں کثرت سے استعمال کیے ہیں، ہم آہنگ نہیں ہے اور خواتین کے لیے گھریلو تعلیم کے ماڈل کے علاوہ کسی بھی دوسرے نظریہ نے سرسید کو متاثر نہیں کیا) سراسر غور و فکر سے عاری ہے۔

□□□

Dr. Mohd Ameen Meer
Department of Urdu
University of Kashmir
Hazratbal Srinagar-190006 (J & K)

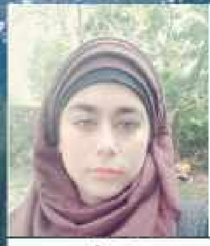

زمرودہ محمد میر

جموں و کشمیر کی ثقافت اور افسانہ نگار

تہذیب وثقافت کوانسانی زندگی کا بنیادی اصول سمجھا جاتا ہے۔ ثقافت یعنی ایک معاشرے اور ایک قوم کی اپنی خصوصیات اور عادات و اطوار اس کا طرز فکر، اس کا دینی نظریہ، اس کے اہداف ومقاصد یہی چیزیں ایک ملک یا کسی قوم کی بنیاد ہوتی ہیں۔ یہی وہ بنیادی چیزیں ہیں جو ایک قوم کوشجاع اور خودمختار بنادیتی ہیں اوران کا فقدان قوم کو بزدل بنادیتا ہے۔ ہر قوم کی ایک تہذیبی شخصیت ہوتی ہے اس شخصیت کے بعض پہلو دوسری تہذیبوں سے ملتے جلتے ہیں لیکن بعض ایسی انفرادی خصوصیتیں ہوتی ہیں جو ایک قوم کی تہذیب کو دوسری تہذیبوں سے الگ اور ممتاز کردیتی ہیں۔ ہر قومی تہذیب اپنی انہی انفرادی خصوصیتوں سے پہچانی جاتی ہیں۔ جب ہم ریاست جموں وکشمیر کی تہذیب وثقافت کی بات کرتے ہیں تو اس کے بعض عناصر ایسے ہیں جو اسے دوسری قوموں کی تہذیب و ثقافت سے ممتاز بنادیتے ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے اس قدر دلچسپ ہے کہ کوئی اسے فراموش نہیں کرسکتا۔ جموں وکشمیر کی اس منفرد تہذیب و ثقافت کو خاص طور پر یہاں کے تمام افسانہ نگاروں نے اپنے اپنے انداز سے افسانوں میں اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں کشمیر کے قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ یہاں کے عوام کی کسمپرسی کوبھی پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں جہاں کشمیری عوام کا سارا کرب جھلکتا ہے وہیں کشمیری تہذیب وثقافت کے تمام رنگ بھی نظر آتے ہیں اس طرح جموں وکشمیر کے افسانوں میں کشمیر ایک موضوع کی حیثیت سے سامنے آیا ہے جس سے کشمیری تہذیب وثقافت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں۔ اس سلسلے میں جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے جس افسانہ نگار کا نام سب سے پہلے سامنے آتا ہے وہ پریم ناتھ پردیسی ہیں۔

پریم ناتھ پردیسی کے افسانوں کا موضوع کشمیری تہذیب سے جڑا ہوا ہے۔ انھوں نے کشمیری عوام کی کسمپرسی اوران کے رسم ورواج کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے یہاں کشمیر کی تہذیب وتمدن، تقسیم وطن، ظلم وجبر، لوٹ کھسوٹ، غربت اور بے روزگاری کی سچی اور واجب عکاسی ملتی ہے۔ ان کے افسانوں میں اکثر وبیشتر مقامات پر کشمیری زبان کے الفاظ ساوار، کانگڑی اور پھرن جیسے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ سید احتشام حسین پریم ناتھ پردیسی کے متعلق رطراز ہیں:

> "پردیسی کوکشمیر کی زندگی، تہذیب اور روایات سے محبت تھی اوران ہی کو وہ اپنے افسانوں میں پیش کرکے عام انسانوں کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ یہی ایک افسانہ نگار اور انسان کی حیثیت سے ان کی بڑائی ہے۔"

(بہتے چراغ۔ پریم ناتھ پردیسی۔ بروکار پریس سرینگر۔1955۔ص14)

پریم ناتھ درنے بھی کشمیری تہذیب وثقافت کواپنے افسانوں میں

ہمیشہ کے لیے زندہ رکھا ہے۔ انھوں نے کشمیری تہذیب و ثقافت کے پوشیدہ نقطوں کو بھی ابھارا ہے۔ غریب و معصوم عوام سے اظہار و ہمدردی اور وطن پرستی ان کے افسانوں کے خاص موضوعات ہیں۔ پریم ناتھ در کشمیری تہذیب و ثقافت کی عکاسی کرنے میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کردار موضوع اور ماحول کشمیری ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں جابجا کشمیری زبان کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ جی۔ آر حسرت گڈا اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"در کی کہانی پڑھ کر کشمیر کی یاد تازہ ہوتی ہے وہ ہر وقت سبحان، عزیزہ، رحمان، رام جو اور گنوتی بیکسی کا ذکر کرتے رہتے ہیں اور فکر مند رہتے ہیں کشمیر کے تمام افراد ترقی اور خوشحالی کی زندگی بسر کریں۔"

(چناروں کے سائے میں۔ پریم ناتھ در۔ فنکار کلچرل آرگنائزیشن سری نگر، کشمیر، 1991۔ ص 17)

ریاست جموں و کشمیر سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگار حامدی کاشمیری کے افسانے کشمیری تہذیب و ثقافت کا بھرپور احاطہ کرتے ہیں۔ انھوں نے کشمیری ماحول، رہن سہن، طرز زندگی اور یہاں کے دلکش مناظر کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانوں میں جابجا کشمیری شال، سماوار، کانگڑی، پھرن، سیب، چنار اور شہتوت کے درختوں، برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کی چوٹیوں، جھیل ڈل وغیرہ کا تذکرہ ملتا ہے۔ "اندھیروں میں"، "بہار آنے تک"، "ادھوری کہانی"، "پمپوش"، "اندھیرے کی روشنی" حامدی کاشمیری کے ایسے افسانے ہیں جو کشمیری تہذیب و ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے افسانے "شہر افسوں" سے اقتباس ملاحظہ کیجیے جس میں انھوں نے کشمیری گیت میں جھیل ڈل اور چار چنار کی تصویر کھینچی ہے۔

ڈلس منز باغ چھند چار چنار
عاشقو روٹ تتھ جائے کرار
جائے سر سبز پر بہار
کیا نعمو یوان کھنئ

جھیل ڈل کے بیچ و بیچ چنار کے چار درخت ہیں
یہ ایسی جگہ ہے یہاں عشاق کرار تسکین پاتے ہیں
یہ ایسی جگہ ہے جو بہار کی رعنائیوں اور تازگیوں سے معمور ہے
اور اس جگہ بڑی اچھی اچھی نعمتوں کا لطف اٹھایا جاتا ہے۔

(شہر افسوں۔ حامدی کاشمیری۔ کمیونٹی راج باغ سری نگر۔ 2009۔ ص 17)

نور شاہ جموں و کشمیر کے ایک منجھے ہوئے فنکار ہیں۔ کہانی کو گھڑنے میں انھیں کمال کی قدرت حاصل ہے۔ ان کے اب تک چھ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ کشمیر کے لوگوں کا حسن و جمال اور وہاں کے دلکش قدرتی مناظر کا جمال و کمال نمایاں طور پر ان کے افسانوں میں جھلکتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں یہاں کے پھولوں، پھلوں، زعفران، سیب، کشمیری شال اور ہوس بوٹوں کا ذکر ملتا ہے۔ نور شاہ نے افسانہ "علیا اور بلبل" گلمرگ گرد و پیش میں مقامی لوگوں کی غریبی اور مجبوری کی عکاسی کی ہے جو بیرون ریاست سے آنے والے سیاحوں کو گھوڑوں پر سیر کراتے ہیں۔ "اندھیرے اجالے" میں کشمیر کے برف سے لدے پہاڑوں، جھیل ڈل کی کشتیوں اور ہوس بوٹوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ افسانہ "تتلی" جھیل ڈل میں رہنے والے بانجیوں کی زندگی کو پیش کرتا ہے۔ کشمیر کی خواتین شرم و حیا کی پیکر، باللباس اور اپنے شوہر کی فرمانبردار ہیں وہ اپنی تہذیب کی پابند ہوتی ہیں۔

نور شاہ نے افسانہ "مرغابی" میں کشمیری عورتوں کے اسی تہذیبی نقطے کو ابھارا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"یہ تو اپنی اپنی تہذیب ہے۔ مرد کماتے ہیں، محنت کرتے ہیں۔ عورتوں کی اپنی دنیا ہے۔ یہاں کی عورتیں اپنے خاوندوں کے اشاروں پر چلتی ہیں۔ غیروں کی طرف دیکھنا گناہ سمجھتی ہیں۔ آپ کے ہاں کی عورتیں حسن کی نمائش کرتی ہیں دوست بناتی ہیں۔"

(ویرانے کے پھول۔ نور شاہ۔ چاند پریس جموں۔ اشاعت 1962۔ ص 104)

"اجنبی شہر کے لوگ"، "خواب بھی بکتے ہیں"، "چراغ گل کرو"، "ایک کہانی کے تین باب"، "میرے حصے کے خواب"، "بتوت کی آخری رات" وغیرہ نور شاہ کے ایسے افسانے ہیں جن میں کشمیری تہذیب و ثقافت کی عکاسی کی گئی ہے۔

ریاست جموں و کشمیر کے افسانوی ادب کا جہاں تک تعلق ہے تو یہاں کئی خواتین اپنی کاوشوں سے افسانوی کینوس پر رنگ بکھیرتی نظر آتی ہیں۔ ان میں ترنم ریاض سرفہرست ہیں۔ ان کی پہلی ہی آہٹ افسانوی دنیا میں ایک ارتعاش پیدا کر گئی اور یوں جموں و کشمیر میں نسائی ادب کے خوش آئند دور کی شروعات ہوئی۔ ترنم ریاض کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہو کر دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ انھیں کشمیر سے بے حد الفت ہے اور اس کی ہر شے سے واقفیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے کشمیری تہذیب و ثقافت کے مختلف پہلوؤں کو اپنے افسانوں میں ابھارا ہے۔ افسانہ "کشتی" میں انھوں نے کشمیری لباس پھرن اور کانگڑی کی بناوٹ کے حربے کا تذکرہ کیا ہے۔

"مجمہ" میں پھرن، کشمیری ٹوپی، سماوار، پیپر ماشی، دست کاری، جھیل ڈل اور جھیل ولر کا ذکر کیا گیا ہے۔ نمکین چائے جو کشمیری تہذیب کا ایک اہم حصہ ہے اس کے علاوہ سنگھاڑے، گیہوں کی روٹیاں اور ستو کی بھرپور عکاسی افسانہ "بمبر زل" میں کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں اس افسانے میں کشمیر کی مشہور شاعرہ "حبہ خاتون" جس کا اصل نام "زون" تھا کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

ترنم ریاض نے جس مہارت اور فنکارانہ انداز سے اپنے افسانوں میں کشمیری تہذیب وثقافت کی ترجمانی کی ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ ان کے افسانہ "حور" سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"اندر فیروزی رنگ ملی ہوئی ملتانی مٹی سے پتے ہوئے ایک چھوٹے شفاف کمرے میں شریفا جھیل میں اگی لمبی لمبی گھاس سے بنی ہوئی چٹائی "وگو" پر بیٹھی کرم کا ساگ چن رہی تھی۔ ٹھنڈے ٹھنڈے بھیگے ساگ کو چنتے چنتے جب اس کے ہاتھ سرد ہوتے لگتے تو وہ اپنے دونوں ہاتھوں کو سمیٹ کر اپنے پھرن کی آستینوں کے اندر کھینچ لیتی اور انی گلابی گلابی انگلیوں سے کانگڑی کے ہتھے تھام لیتی اور لطیف آنچ سے آسودہ ہو کر پھر ساگ چننے لگتی۔ اس نے کانگڑی پھرن سے باہر نکال دی اور اس میں پڑے ہوئے اپلوں کی گرم راکھ کو کانگڑی کے ساتھ بندھی ہوئی لوہے کی چمچی (ژالن) سے الٹ پلٹ کرتے ہوئے بتایا کہ اس کا پردہ ہو گیا ہے۔"

(یہ تنگ زمین۔ ترنم ریاض، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دریا گنج نئی دہلی۔1998ء، ص40)

ترنم ریاض کی تخلیق کردہ دیگر کہانیاں جو کشمیری تہذیب وثقافت کی ترجمانی کرتی ہیں ان میں "برف گرنے والی ہے"، "ماں صاحب"، "اماں" اور "پھول" قابلِ ذکر ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے جن افسانہ نگاروں نے اپنی کہانیوں کے ذریعے کشمیری تہذیب وثقافت کو مختلف عناصر کے ذریعے اپنے اپنے مخصوص انداز سے ابھارا ہے ان میں فہرست حسب ذیل ہیں:

پشکر ناتھ (جوڑا ابابیلوں کا، کانچ کی دنیا، ٹروٹ مچھلی، درد کا مارا، پل نمبر صفر کے گدھ)

حسن ساہو (عکس، اعتراف)

عمر مجید (محمد شمیم کو کشمیر جانا ہے، مردہ چنار)

دیپک بدکی (کبھی ہم سے سنا ہوتا، میں ساری کی ساری تمھاری، پروٹوکال، ریزہ ریزہ حیات، زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی)

خالد حسین (سانجھا درد، میرے بندے کہانی، لکیر، ستی سر)

ورِیندر پٹواری (روبوٹ، برف، دسرتھ)

شبنم قیوم (ایک زخم اور سہی، میری جوانی تیرا انعام، روشنی بجھاؤ)

تیج بہادر بان (جوتے، جہلم کے سینے پر)

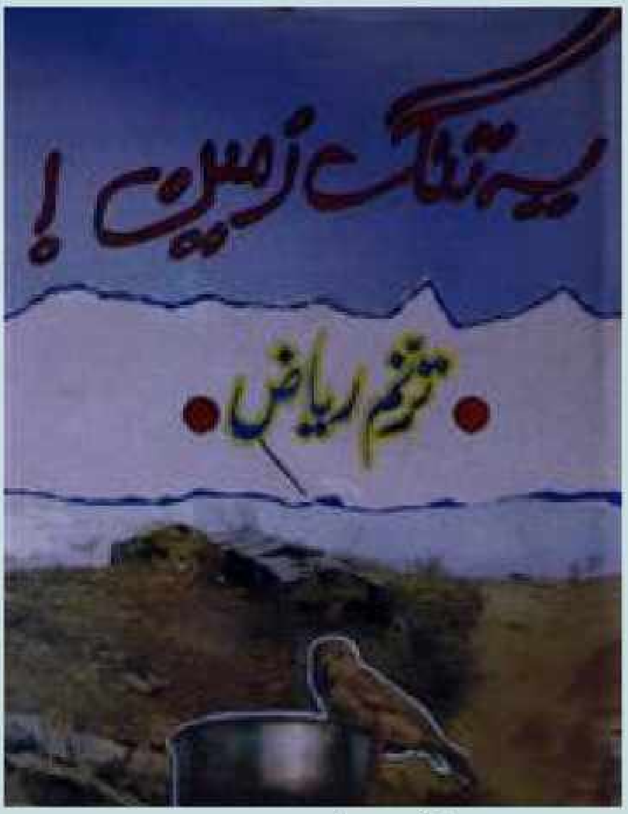

موہن یاور (دو کنارے)

ڈاکٹر نگہت فاروق نظر (ایک خواب ادھورا سا)

ڈاکٹر ریاض توحیدی (ہوم لینڈ، ماشٹر گان لال، کالے دیوِدہ کی واپسی)

وحشی سعید (میٹھا چشمہ اور میں، وہ صبح کب آئے گی، طوفان، اپنا عکس اپنا آئینہ، نجات دہندہ، عورت اور مچھلی، ہڑتال وغیرہ)

الغرض ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے تمام افسانہ نگاروں نے کشمیری تہذیب وثقافت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور کشمیری تہذیب وثقافت کا کوئی نہ کوئی عنصر ان کے افسانوں میں رقص کناں ہے۔

□□□

Zamrooda Mohammad Mir
D/O:Ghulam Mohammad Mir
R/O:Sopore
P/O:Sopore-193201 (Jammu & Kashmir)

نازیہ

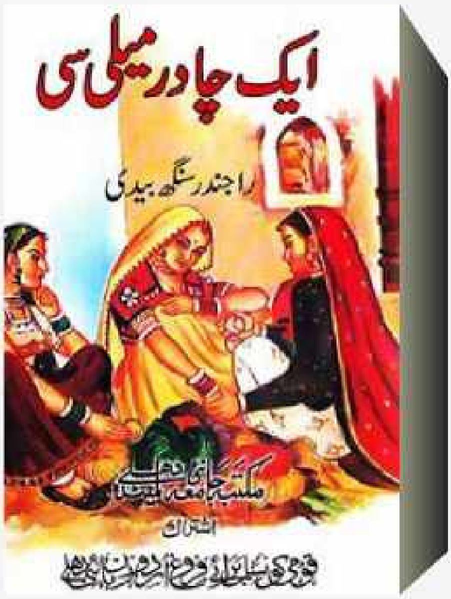

’ایک چادر میلی سی‘ کے نسوانی کردار

’ایک چادر میلی سی‘ اردو کا گراں قدر ناول ہے۔ محض اس ایک ناول کی وجہ سے راجندر سنگھ بیدی کا شمار اردو کے اہم ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ بیدی کی ساری توجہ افسانہ پر رہی، تاہم ناول نگاری کی صلاحیت بھی ان کے اندر کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس کا بین ثبوت ’ایک چادر میلی سی‘ ہے۔ بیدی کا یہ ناول فن کی کسوٹی پر کھرا اترتا ہے اور اپنے جلو میں متعدد ایسی خصوصیات رکھتا ہے جو اسے دوسرے ناولوں سے ممیّز بنا دیتا ہے۔ ناول مختصر ہے مگر اس میں زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو توازن کے ساتھ سمیٹا گیا ہے۔ ڈاکٹر پرویز شہریار لکھتے ہیں:

> ”اس ناول میں بیدی کی فنکاری کا امتیازی وصف یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اس مختصر سے شہ پارے میں سماجیات، نفسیات، معاشیات اور روحانیات کو غایت درجہ توازن سے جگہ دی ہے اور اس بات کا بہت ہی فنکارانہ مہارت اور باریک بینی سے خیال رکھا ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی بھی پہلو دوسرے پہلو کے بار تلے دب کے نہ رہ جائے۔“

(راجندر سنگھ بیدی کی ناول نگاری، ص 131، ناشر: دارالاشاعت مصطفائی، کوچہ پنڈت لال کنواں، اشاعت 2017)

’ایک چادر میلی سی‘ پلاٹ کے اعتبار سے بھی عمدہ ہے اور کردار نگاری کے اعتبار سے بھی۔ پلاٹ پر گہری نظر ڈالنے کے بعد یہ بات محسوس کی جاسکتی ہے کہ بیدی نے اس ناول کا پلاٹ بہت باریکی سے تیار کیا ہے جس میں بھرپور تسلسل اور ربط موجود ہے، کہیں خلا کا احساس نہیں ہوتا۔ واقعات

ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہیں کہ ان کی حیثیت اجزائے لاینفک کی ہوگئی ہے۔

اگر ناول کو کردار نگاری کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کردار نگاری کے لحاظ سے یہ اعلیٰ پایہ کا ناول ہے۔ ناول میں کرداروں کی کثرت ہے، اس کے باوجود ناول میں کوئی جھول نظر نہیں آتا اور نہ پیچیدگی محسوس ہوتی ہے۔ جب کہ بہت سے ناول کثرتِ کردار کی وجہ سے فلاپ ہوگئے اور ان کی کہانی یا تو الجھ کر رہ گئی یا متعدد حصوں میں منقسم ہوگئی۔ بیدی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ناول میں بہت سے کرداروں کو شامل کیا مگر کہانی کو نہ الجھنے دیا اور نہ بٹنے دیا۔ ناول میں درجنوں کردار ہیں مگر سب ایک ہی کہانی کو مکمل کرتے ہیں۔ ناول میں کثرت کردار کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں حضور سنگھ، تلوکا اور منگل بھی ہے اور جنداں، رانو، بڑی، سلامتے جیسے کردار بھی ہیں۔ ان کے علاوہ گھنشیام، مہربان داس، باواہری جیسے اور بھی کئی کردار ہیں۔ ان کرداروں میں بعض مثبت ہیں اور بعض منفی، بعض نیک وصالح اور بعض بد اور حریص۔ ایک ہی ناول کے اندر اتنے کرداروں کو جمع کرنا اور توازن کے ساتھ ان کو پیش کرنا بڑی فنکاری کی بات ہے جس میں بیدی کامیاب نظر آتے ہیں۔

'ایک چادر میلی سی' کے نسوانی کرداروں کا بھی جواب نہیں بلکہ یہ کردار اس ناول میں روح کی طرح بسے ہوئے ہیں۔ ان کے بغیر ناول کی کامیابی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ نسوانی کرداروں میں سب سے اہم کردار 'رانو' کا ہے بلکہ تمام کرداروں میں یہ کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ ناول 'ایک چادر میلی سی' اسی کردار کے گرد گھومتا ہے۔ بیدی نے ناول کی کہانی کا تانا بانا اسی کردار (رانو) سے تیار کیا ہے اور پھر اسے اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ کردار امر ہوگیا۔ ڈاکٹر شمیم نکہت نے کردار 'رانو' کے حوالے سے لکھا ہے:

> ''اس میں ہندوستانی عورت کی ساری امنگوں اور آرزو مندیوں کو مجسم کردیا ہے۔ اور پھر اسے مردوں کے بنائے ہوئے ایک ایسے جہنم میں تنہا چھوڑ دیا ہے جسے سماج کہتے ہیں۔ پسماندگی، جہالت اور عسرت کو خاموشی سے سہنے والا سماج جو اپنی ذلتوں اور اس کا انتقام اس عورت سے لیتا آیا ہے جو جنتی ہے جس کے دل میں ایثار، ہمدردی اور محبت کی موجیں اس طرح امنڈتی ہیں کہ بے کنار سمندر بھی پناہ مانگتا ہے جو اس دھرتی پر قدرت کی سب سے حسین تخلیق ہے۔''

رانو جوان اور صحت مند و پرکشش عورت ہے۔ وہ اپنی ذمہ داریوں سے واقف بھی ہے اور انھیں نبھانے کی حتی الامکان کوشش بھی کرتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کا شوہر ہر ایک برائی سے دور رہے، اس لیے وہ اپنے شوہر کی شراب نوشی کو قطعاً پسند نہیں کرتی اور اسے چھڑوانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ وہ اسے سمجھاتی بھی ہے، ناراض ہو کر بھی دکھاتی ہے، ٹوٹکے بھی کرتی ہے اور مار بھی کھاتی ہے۔ اس کے اندر ممتا بھی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، اس لیے اپنے بچوں کے لیے فکرمند رہتی ہے۔ اس کی بڑی بیٹی 'بڑی' جیسے جیسے بڑی ہوتی ہے وہ اس کی شادی کے بارے میں سوچنے لگتی ہے اور وہ بے راہ روی کی شکار نہ ہو، اس لیے اس پر نظر رکھتی ہے۔ جب اس کے شوہر تلوکا کا قتل ہوجاتا ہے تو وہ اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ دوکانداروں سے ادھار مانگ کر لاتی ہے جب وہ بھی ادھار دینا بند کردیتے ہیں تو کوئی کام کرنے کے بارے میں سوچنے لگتی ہے یہاں تک کہ بچوں کو بھکمری سے بچانے کے لیے محنت از خود مزدوری کی بھی بات کرتی ہے۔ جب کسی طرح بات نہیں بنتی ہے اور پڑوس کی عورتیں اسے منگل سے شادی کے لیے کہتی ہیں تو وہ نہ چاہنے کے باوجود راضی ہوجاتی ہے کہ کسی طرح گھر تو چلے۔ منگل سے شادی کے بعد بھی اس کی پریشانیاں کم نہیں ہوتیں، کیونکہ منگل نہ اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور نہ اپنی آوارگی سے باز آتا ہے۔ اس موقع پر بھی رانو صبر اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرتی ہے اور پھر ایک دن منگل کو راہ راست پر لے آتی ہے۔ اس کی بیٹی بھی بکنے سے بچ جاتی ہے، اس کی خوبرو، صحت مند لڑکے سے شادی ہوجاتی ہے۔ گویا کہ پورے ناول میں رانو چھائی ہوئی ہے۔ راجندر سنگھ بیدی رانو کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ایک چادر میلی سی' کی رانو ایک مجبور اور مقہور لڑکی تھی جسے اس کے ماں باپ نے اپنے افلاس سے تنگ آکر روٹی کپڑے کے عوض تلوکے کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ تلوکے کے قتل کے بعد اسے اپنے دیور 'منگل' سے شادی کرنی پڑتی ہے۔ پھر اپنے نئے شوہر کو رام کرنے کے لیے اسے تریا چرتر کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ شراب سے وہ سخت نفرت کرتی تھی، آخر اسے ہی بروئے کار لا کر منگل کو جیتنا پڑتا ہے۔ وہ ایک مطیع اور فرماں بردار شوہر بن جاتا ہے۔... مرد کتنی بھی بغاوت کرلے 'شکتی' یا 'مایا' اسے آلیتی ہے۔ رانو ایک عام گوشت پوست کی عورت اپنے آپ کو Develop کرنے کے بعد آخر میں دیوی ہوجاتی ہے۔''(49)

رانو کے کردار کے ذریعے بیدی نے عورت کے مسائل کو اجاگر کیا

ہے اور بتایا ہے کہ عورتوں کو کس طرح کی مصیبتوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سسرال میں پورے گھر کی ذمہ داری الگ اٹھانی پڑتی ہے، ہزار مصیبتیں اٹھا کر بھی وہ کہیں نہیں جاسکتی۔ رانو کی زبانی ہی سنیے:

''عورت ہونا ہی گناہ ہے۔ بیٹی تو کسی دشمن کے بھی نہ ہو بھگوان! ذرا بڑی ہوئی ماں باپ نے سسرال دھکیل دیا۔ سسرال والے ناراض ہوئے مائیکے لڑھکا دیا۔ ہائے، یہ کپڑے کی گیند! جب اپنے ہی آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہے تو پھر لڑھکنے جوگی بھی نہیں رہتی۔''

بیدی نے رانو کو مجبور ومقہور ہونے کے ساتھ صبر واستقلال کا پیکر بھی دکھایا ہے کہ وہ سخت اور نازک حالات میں بھی ہار نہیں مانتی اور اس کے قدم نہیں ڈگمگاتے۔ جب وہ تلوکا کو شراب سے روکنے پر اڑتی ہے تو پیچھے نہیں ہٹتی یہاں تک کہ اس کو لہولہان کردیا جاتا ہے۔ وہ اپنی بات پر اٹل رہتی ہے اور ہار نہیں مانتی

بیدی نے رانو کی زبانی یہ جملے ادا کرا کر عورت کی بے بسی کو بڑے موثر انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ کہانی صرف رانو کی نہیں بلکہ پورے سماج کی ہے۔ جس عہد میں بیدی نے یہ ناول لکھا تھا، اس وقت عورتوں کے ساتھ کیا ہوتا ہوگا اور انھیں کتنی بے کسی کی زندگی گزارنی پڑتی ہوگی جب کہ موجودہ عہد میں خواتین میں بیداری آئی ہے یہ اکیسویں صدی ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سابقہ صدیوں سے مختلف ہے، اس صدی میں انسان ترقی کے اعلیٰ مدارج کو طے کررہا ہے، تیزی کے ساتھ ہر جگہ تغیرات واقع ہورہے ہیں، عورتوں کو آزادی مل رہی ہے، وہ آج ہر شعبے میں نظر آتی ہیں۔

بیدی نے رانو کو مجبور ومقہور ہونے کے ساتھ صبر واستقلال کا پیکر بھی دکھایا ہے کہ وہ سخت اور نازک حالات میں بھی ہار نہیں مانتی اور اس کے قدم نہیں ڈگمگاتے۔ جب وہ تلوکا کو شراب سے روکنے پر اڑتی ہے تو پیچھے نہیں ہٹتی یہاں تک کہ اس کو لہولہان کردیا جاتا ہے۔ وہ اپنی بات پر اٹل رہتی ہے اور ہار نہیں مانتی۔ اگلے دن جب تلوکا شراب پینے کی بات کرتا ہے اور کہتا ہے:

''عورتوں سے وہ ڈرتے ہیں جو نامرد ہوتے ہیں... آج میں پھر لاؤں گا میٹھے مالٹے کی بوتل، دیکھوں گا تو کیسے روکتی ہے۔''

تو اس وقت رانو کچھ نہیں بولتی مگر اپنے دل میں پختہ عزم کرتی ہوئی سوچتی ہے:

''آج یہ لایا میٹھے مالٹے کی بوتل تو میں گلے کی ہولدلی چبالوں گی، بارہ سنگے کا پورا سینگ پیٹ میں گھونپ لوں گی، کتے کی گولی کھا کر مروں گی جو اس دن بوڑی نے کھائی تھی۔''

صبر اور ثابت قدمی کا پہاڑ ہونے کے ساتھ ساتھ رانو وقت کے تقاضوں کو بھی خوب سمجھتی ہے اور حالات سے سمجھوتہ کرنا بھی جانتی ہے۔ کیونکہ کئی مرتبہ ضد پر اڑنے سے معاملات بگڑ جاتے ہیں اور جذبات میں لیے گئے فیصلے غلط ثابت ہوتے ہیں۔ رانو اس اعتبار سے مختلف مواقع پر ایک سمجھدار اور عقلمند عورت ثابت ہوتی ہے۔ ہاں ایک انسان ہونے کی وجہ سے وہ کئی بار جذبات میں بہکتی ضرور ہے مگر پھر سنبھل جاتی ہے۔ جیسا کہ وہ اپنے بچوں کے سکون کے لیے جذباتی طور پر خود ہی فروخت ہونے کے بارے میں سوچنے لگتی ہے مگر پھر اپنی سوچ پر قابو پالیتی ہے۔ ایک بار اپنی بیٹی کو ہی بیچنے کا خیال اسے آنے لگتا ہے مگر پھر جلد ہی سنبھل جاتی ہے اور اپنے اس خیال کو جھٹک دیتی ہے۔ مذکورہ اقتباس میں وہ تلوکا کے ذریعے میٹھے مالٹے کی بوتل لانے پر بارہ سنگے کے سینگ پیٹ میں گھونپنے، کتے کی گولی کھا کر مرنے کی بات ذہن میں لاتی ہے مگر پھر اسے احساس ہوتا ہے کہ ''نہیں نہیں... کسی کا کیا جائے گا... مرجائے گی ماں باپ کی بیٹی... پر، ماں باپ کہاں ہیں... آگا نہ پیچھا... میں نہیں مروں گی... ساس خوش ہوگی کہے گی ستے ہی میں جان چھوٹی۔''

رانو ایک ایسی عورت ہے جو حالات سے سمجھوتہ کرنا بھی جانتی ہے اور وقت پر صحیح فیصلے لینا بھی۔ اس نے کئی ایسے فیصلے لیے جو اس کی طبیعت پر گراں ضرور گزرے اور کچھ وقت تک دل نے ان فیصلوں کو قبول بھی نہ کیا مگر چوں کہ مصلحت اور وقت کا تقاضہ تھا کہ وہ فیصلے لیے جائیں اور ایسا کرکے رانو نے عقلمندی کا ثبوت دیا۔ مثال کے طور پر اس نے پنچایت کے اس فیصلے کو قبول کیا جس میں منگل سے شادی کرنے کی بات کہی گئی تھی۔ حالانکہ یہ بات اس کے لیے عجیب بھی تھی اور مشکل بھی۔ وہ منگل کو اولاد کی طرح سمجھتی تھی، اس کے لیے اس کے جذبات وہی تھے لیکن خاندان کی

بھلائی کے لیے اسے اس فیصلے پر رضامندی ظاہر کرنی پڑی جب کہ ابتدا میں وہ تیار نہ تھی مگر بعد میں مان گئی۔شادی کے بعد منگل کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے اس کی کوشش بھی وقت کے تقاضے کے تحت تھی۔اس کی طبیعت خود اس بات کے لیے تیار نہ تھی مگر اب چونکہ منگل اس کا شوہر تھا، اس لیے جنسی تعلقات کا قائم ہونا ضروری تھا، یہ ازدواجی تقاضہ بھی تھا اور منگل کو بھٹکنے سے روکنے کا ایک راستہ بھی تا کہ وہ راہ راست پر آ کر یکہ چلانے لگے اور گھر کے اخراجات معمول کے مطابق چلنے لگیں۔حالات کو سازگار کرنے اور منگل کو اپنے آپ سے جسمانی و جنسی طور پر قریب کرنے کے لیے وہ اس شراب تک کا سہارا لینے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ کر لیتی ہے جس پر وہ تلوکا سے لڑا کرتی تھی۔اس کے بعد حالات بھی سازگار ہو جاتے ہیں اور منگل بھی اس کا تابعدار بن جاتا ہے۔

بیدی نے 'رانو' کے ذریعے جہاں عورت کی بے بسی ولاچاری کو بیان کیا ہے ، وہیں عورت کی خوبیوں کو بھی اجاگر کیا ہے کہ وہ کس طرح صبر وتحمل سے کام لینے کی استطاعت رکھتی ہے ، کس طرح وہ ثابت قدمی کا پہاڑ ثابت ہوتی ہے ، کس حد تک وہ مصلحت سے کام لیتی ہے اور کیسے وہ ناہموار حالات کو ہموار بنانے میں کامیاب ہوتی ہے .بیدی نے رانو کے کردار کے ذریعے ثابت کردیا کہ عورت سماج کا اٹوٹ حصہ ہے ، وہ سماج کو مکمل بھی کرتی ہے اور سماج کو سنوارنے اور سدھارنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

رانو کا وہ فیصلہ بھی گہری مصلحت کا حامل تھا جو اس نے اپنی بیٹی 'بڑی' کی شادی سے متعلق کیا کہ اس کی شادی اس لڑکے سے کر دی جس نے رانو کے شوہر اور اس کی بیٹی 'بڑی' کے باپ کا قتل کیا تھا۔اپنے شوہر کے قاتل کے ہاتھ میں کوئی عورت اپنی بیٹی کا ہاتھ کیسے دے سکتی ہے؟ لیکن رانو نے یہ بھی کیا، اس لیے کہ لڑکا اچھے گھر سے تھا، جوان اور خوبرو تھا، پھر اپنے گناہ پر نادم و شرمندہ تھا اور خود تلوکا کی بیٹی 'بڑی' سے شادی کا خواہش مند تھا تا کہ اس کے پاپ دھل سکیں اور وہ اپنے اس گناہ کی تلافی کر سکے جو اس نے تلوکا کو قتل کر کے کیا تھا۔رانو نے بہت تکلیفیں اٹھائی تھیں، غربت و افلاس کی زندگی دیکھی تھی، فاقہ زدگی کے عالم میں شب و روز گزارے تھے، بیٹی کے بکنے تک کی نوبت آ گئی تھی، وہ تو عین وقت پر پتہ چل گیا تھا ورنہ تو اس کی ساس جنداں نے تو 'بڑی' کا سودا ہی کر دیا تھا۔ایسے میں اگر اچھا رشتہ اس کی بیٹی کے لیے آیا تو اس نے اسے غنیمت جانا اور بیٹی کے مستقبل کے لیے اس نے اس رشتہ کو قبول کر لیا۔

بیدی نے 'رانو' کے ذریعے جہاں عورت کی بے بسی ولاچاری کو بیان کیا ہے، وہیں عورت کی خوبیوں کو بھی اجاگر کیا ہے کہ وہ کس طرح صبر و تحمل سے کام لینے کی استطاعت رکھتی ہے، کس طرح وہ ثابت قدمی کا پہاڑ ثابت ہوتی ہے، کس حد تک وہ مصلحت سے کام لیتی ہے اور کیسے وہ ناہموار حالات کو ہموار بنانے میں کامیاب ہوتی ہے۔بیدی نے رانو کے کردار کے ذریعے ثابت کر دیا کہ عورت سماج کا اٹوٹ حصہ ہے، وہ سماج کو مکمل بھی کرتی ہے اور سماج کو سنوارنے اور سدھارنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔اس لیے عورت عزت کی مستحق ہے نہ کہ ذلت کی۔لیکن یہ تشویش کی بات ہے کہ سماج اسے حقارت سے دیکھتا ہے یا اس کے ساتھ تحقیر آمیز سلوک کرتا ہے۔جب تک معاشرے میں عورت کو اس کا واجبی حق نہیں ملتا اور اس پر مظالم کا سلسلہ بند نہیں ہوتا، اس وقت تک معاشرے میں امن و امان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

دوسرا نسوانی کردار 'جنداں' ہے۔جنداں گھر کے بزرگ حضور سنگھ کی بیوی، تلوکا کی ماں اور رانو کی ساس ہے۔عمر رسیدہ ہونے کے سبب لاغر ہو گئی ہے مگر گھر کے تمام معاملات میں دخل دیتی ہے۔جنداں کے ذریعہ بیدی نے عورت کے اس روپ کو دکھایا ہے کہ جب وہ ساس بنتی ہے تو کس طرح ظالم و جابر ہو جاتی ہے اور کس طرح بہو کی زندگی میں نہ صرف مداخلت کرنے کی کوشش کرتی ہے بلکہ اسے اپنے اشاروں پر نچانا چاہتی ہے اور اسی لیے وہ اس کے اوپر سوار رہتی ہے اور طعن و تشنیع کا شکار بناتی رہتی ہے۔رانو کے اگرچہ اپنے مسائل تھے، وہ اپنے شوہر کی وجہ سے بھی پریشان تھی اور غربت کی وجہ سے بھی لیکن جنداں نے الگ اس کو پریشان کر رکھا تھا۔تلوکا اسے گھونسے اور لاتوں سے مارتا تھا اور جنداں باتوں سے۔کہتے ہیں کہ باتوں کا زخم تلوار سے بھی گہرا ہوتا ہے۔جنداں رانو کو ایسی باتیں سناتی اور ایسے طعنے دیتی کہ رانو گھایل ہو جاتی۔جب رانو تلوکا کو شراب نوشی سے روکنے کی کوشش کرتی ہے اور تلوکا اسے پیٹتا ہے تو جنداں رانو کے خلاف بول پڑتی ہے۔منگل اسے ان دونوں کے درمیان کی لڑائی

میں نہ بولنے کے لیے کہتا ہے تو جنداں کہتی ہے:

''کیوں نہ بولوں؟...اپنی کمائی سے پیتا ہے، اس کے باپ کمینے سے تو مانگنے نہیں جاتا؟ خود تو کھپ گیا، یہ کلنج (چیل) چھوڑ گیا ہمارے لیے۔''

جب تلوکا رانو کو گھر سے نکالنے کی بات کرتا ہے اور رانو جانے کی تیاری کرتی ہے تو منگل پریشان ہوجاتا ہے اور کہتا ہے کہ بھابھی کہاں جائے گی؟ جنداں فوراً بول پڑتی ہے کہ ''جائے گی کہاں آ گا نہ پیچھا۔''

تلوکا کے قتل کے بعد تو جنداں نے رانو کو اور زیادہ پریشان کرنا شروع کردیا اور اسے ہر وقت طعن و تشنیع دینے لگی۔ جیسا کہ تلوکا کے قتل کی ذمہ دار وہی ہو۔ جنداں اسے گھر سے نکلنے کے لیے کہتی، دھتکارتی اور بددعائیں دیتی ہیں۔ ایک دن منگل سے رہا نہ گیا اور وہ اپنی ماں 'جنداں' سے یہ کہنے لگا:

''تائی کیوں تو روز اس گریب کے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہے؟ کیوں روز مارتی، دھکے دیتی ہے۔ آخر کہاں جائے گی بے چاری؟ ...قصور بھابھی کا نہیں میرا ہے؟''

اس پر جنداں بول پڑتی ہے کہ:

جو عورت اپنے بچوں کی نہیں وہ اور کس کی ہوگی؟ اور پھر رانو کی طرف منہ کرکے، ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی: گرو کے واسطے، بھگوان کے واسطے، دیوی ماں کے واسطے تو اب جا...دفان ہوجا۔ جو اندھا کانا ملتا ہے کرلے یہاں سے مرلے۔''

اس طرح آئے دن جنداں رانو کو طنز کا نشانہ بناتی ہے اور گھر سے نکالنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ پورے گھر پر اپنا حق جتاتی ہے یہاں تک کہ بچوں پر بھی اور اسی لیے اپنی پوتی 'بڑی' کو کسی سے پوچھے بغیر بیچنے کے لیے تیار ہوجاتی ہے۔ بیدی نے جنداں کے کردار کو پیش کرکے سماج کو آئینہ دکھایا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ بیدی نے اس ناول کے ذریعے سماج کے مسائل کو اجاگر کرکے سماج کی اصلاح کا کام بھی کیا ہے۔ چنانچہ بیدی نے منفی کرداروں کو بعد میں مثبت بنا کر پیش کیا ہے اور یہ فطرت کے خلاف نہیں ہے، بہت سے لوگ بعد میں کسی واقعہ سے متاثر ہوکر اپنی غلطیوں اور گناہوں سے تائب ہوجاتے ہیں اور بدی کو چھوڑ کر نیکی کی طرف آجاتے ہیں۔ جنداں بھی بعد میں راہ راست پر آجاتی ہے اور لعنت وملامت کو چھوڑ کر بہو کی تعریف کرنے لگتی ہے۔

'ایک چادر میلی سی' میں دوسرے ذیلی نسوانی کردار بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ رانو کی بیٹی 'بڑی'، رانو کی پڑوسن چنوں اور منگل کی معشوقہ 'سلامتے' سب اپنی اپنی جگہ اہم ہیں اور ناول کی مقبولیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ 'بڑی' رانو کی بیٹی ہے جسے بیاہنے کی فکر رانو کو پریشان کرتی ہے کیونکہ جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی چلی جاتی ہے، لڑکوں کی نگاہیں اس کی طرف اٹھنے لگتی ہیں۔ 'بڑی' خوبصورت بھی ہوتی ہے، اس لیے رانو اس پر نگاہ رکھتی ہے کہ کہیں اس کے قدم بھی ڈگمگانے نہ لگیں۔ لیکن غربت کی وجہ سے اس کی شادی کرنا آسان نہیں ہوتا۔

ناول کے نسوانی کرداروں میں 'چنوں' کی اپنی جگہ اہمیت ہے کہ وہ رانو کی پڑوسن ہے اور رانو کے ساتھ ہمدردی کا معاملہ کرتی ہے۔ رانو کی پریشانیوں کا اسے بخوبی علم ہے، اس لیے وہ اکثر رانو سے ملتی رہتی ہے اور اسے سمجھاتی ہے۔ جب رانو کے شوہر کا قتل ہوجاتا ہے اور رانو مصیبت میں گھر جاتی ہے تو وہی منگل سے شادی کے لیے اسے تیار کرنے کی سعی کرتی ہے تاکہ رانو کا گھر بس جائے۔ مگر چوں کہ رانو منگل کو اپنی اولاد کی طرح خیال کرتی ہے، اس لیے اس شادی کے لیے اس کا تیار ہونا آسان بات نہیں ہوتی، اسی لیے چنوں بڑی حکمت سے اسے سمجھاتی ہے اور کہتی ہے:

''یہ جنداں بندی۔ یہ ساس تیری تجھے جینے نہ دے گی۔ اس گھر میں بسنے نہ دے گی، یہاں رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے ...وہ یہ کہ تو منگل سے شادی کرلے، چادر ڈال لے اس پہ۔''

گویا کہ اس کردار سے بھی راجندر سنگھ بیدی نے مثبت کام لیا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جس سماج میں جنداں جیسی عورتیں ہوتی ہیں، اسی سماج میں چنوں جیسی ہمدرد اور نرم دل عورتیں بھی بستی ہیں جو دوسرے کا برا نہیں بھلا چاہتی ہیں۔ عورتوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے تاکہ سماج میں ان کے مسائل کم ہوں اور ان کا مقام بلند ہو۔ غرض یہ کہ ناول 'ایک چادر میلی سی' کے نسوانی کردار بڑے زوردار ہیں۔ ناول کا پہلو بہ پہلو جائزہ لیتے ہوئے انھیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

□□□

Nazia
D/o. Rais Alam
H.No-1086
Street No.36
Jafrabad (Near Kunwe Wali Masjid)
Delhi-110053

خواجہ عبدالمنتقم

سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ

ہندو خاتون کو موروثی جائیداد میں مشترکہ وراثت کا حق

دنیا کی مختلف تہذیبوں اور بیشتر مذاہب عالم میں عورت کو موروثی جائداد میں کما حقہ حصہ ملنے کے معاملے میں امتیاز برتا گیا ہے البتہ یہ امر باعث اطمینان ہے کہ بہت سے مذاہب وثقافتوں میں قدیم دور میں جو کمیاں تھیں ان میں سے بہت سی کمیاں دور ہو چکی ہیں۔اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو کوئی بھی ملک، تہذیب، معاشرہ یا کوئی بھی ثقافت ہو، عورتوں کی معاشی، معاشرتی وعائلی حیثیت زمینی سطح پر ثانوی رہی ہے خواہ اوراق آئین ودیگر قوانین میں انھیں برابری کا درجہ کیوں نہ دیا گیا ہو۔اگر ہم مختلف تہذیبوں میں خواتین کے حقوق وراثت کا محض سرسری طور پر بھی جائزہ لیں تو ہم یکدم اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ ان کے ساتھ بیشتر تہذیبوں میں انصاف نہیں ہوا ہے۔بابلی اور یونانی جیسی علمی وتمدنی اعتبار سے دنیا کی بہترین تہذیبوں میں بھی موروثی جائداد میں اولاد نرینہ یعنی صرف بیٹوں کو ہی حصہ ملتا تھا اور بیٹی کو موروثی جائداد میں کسی بھی طرح کا حق وراثت حاصل نہیں تھا۔ضوفشانی اسلام سے قبل عہد جاہلیت میں عرب معاشرے میں بھی خواتین کو حقوق وراثت حاصل نہیں تھے۔

ہندو کوڈ منظور ہونے سے پہلے ہندو خواتین کو بھی موروثی جائداد میں کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔انھیں یہ حق، وراثت ہنود ایکٹ (Hindu Succession Act) کے تحت حاصل ہوا۔اس قانون میں 1955 کے ترمیمی ایکٹ کے ذریعہ دیگر باتوں کے ساتھ یہ التزام کیا گیا تھا کہ اس قانون کی رو سے، اس قانون کے نفاذ سے ہی ہندو مشترکہ خاندان، جس پر ہندو قانون کا میتا کشر مکتب فکر لاگو ہوتا ہے، کی بیٹی:

(الف) جنم سے ہی اپنے حق کے طور پر اسی طرح شریک وراثت ہوگی جس طرح ایک بیٹا ہوتا ہے۔

(ب) اسے ایسی شرکت وراثت جائداد (Co-parcenery property) میں وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اسے بیٹا ہونے کی صورت میں حاصل ہوتے۔

اس طرح 1955 کے ترمیمی ایکٹ کے ذریعہ موروثی جائداد کے حقوق وراثت کے حوالے سے بیٹے اور بیٹی کو مساوی حقوق دے کر ان کے مابین جو ماقبل بھید بھاؤ تھا اسے ختم کر دیا گیا تھا مگر اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی تھی کہ اس قانون کے نفاذ کے وقت والد کے زندہ ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق تو نہیں پڑے گا یا بہ الفاظ دیگر اس بات کی وضاحت نہیں کی گئی تھی کہ اس ترمیمی قانون کا نفاذ موثر بہ ماضی (retrospective effect) ہوگا یا نہیں۔اب سپریم کورٹ کی جسٹس ارون مشرا، جسٹس ایس۔اے۔نذیر اور جسٹس ایم آر شاہ پر مشتمل سہ رکنی بینچ نے اپنے 11 اگست 2020، کو ونیتا شرما بنام راکیش شرما والے

معاملے [Civil Appeal No. 32601 of 2018]و دیگر Special Leave Petitions میں دیئے گئے ایک کلیدی فیصلہ میں اس بات کی وضاحت کردی ہے کہ ہر ہندو خاتون کو موروثی جائداد میں مشترکہ وارث ہونے کا حق جنم سے ہی حاصل ہوگا خواہ اس کے والد 2005 میں لائے گئے ترمیمی قانون کے وقت زندہ تھے یا نہیں۔عدالت کا کہنا ہے کہ بیٹی ہمیشہ بیٹی رہے گی اور بیٹا تب تک بیٹا رہتا ہے جب تک اسے بیوی کا ساتھ نہیں ملتا،مگر بیٹی زندگی بھر بیٹی رہتی ہے۔

آیئے اب اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ آخر سپریم کورٹ کو اس وضاحت کی ضرورت کیوں پڑی اور اس کے دور رس نتائج کیا ہوں گے۔اس فیصلہ میں سپریم کورٹ نے راہ انصاف میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی ہے بلکہ اس ہموار راہ کی ہمواری کی وضاحت کی ہے جسے ناہموار سمجھا جا رہا تھا اور وراثت ہنود ایکٹ کی دفعہ 6 ، جو موروثی جائیداد کی وراثت سے متعلق ہے، کی مختلف ہائی کورٹ الگ الگ تعبیر کر رہی تھیں جس کے سبب مختلف ہائی کورٹ متضاد فیصلے کر رہی تھیں اور تعبیری تنازعات کے سبب سپریم کورٹ کے روبرو زیرالتوا معاملات کی تعداد بڑھتی ہی جارہی تھی۔

اس تنازعہ کی ابتداء اس وقت ہوئی جب دہلی ہائی کورٹ میں ونیتا شرما نامی ایک شادی شدہ خاتون نے دہلی ہائی کورٹ میں بحیثیت شریک وراثت ہونے کا دعویٰ کرتے ہوئے عدالت سے وضاحتی حکم جاری کر کے اسے راحت دینے کی درخواست کی۔یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ نہ صرف ہائی کورٹ بلکہ خود سپریم کورٹ اس ایشو کی بابت متضاد فیصلے دیتی رہی تھی۔اس نے پھول وتی اور منگاول والے معاملوں میں یہ فیصلہ دیا تھا کہ بیٹی صرف اس صورت میں موروثی جائداد میں حصہ پانے کی حقدار ہوگی اگر اس کے والد 9 ستمبر 2005 یعنی وراثت ہنود ایکٹ کی ترمیم کے دن زندہ ہوتے جب کہ داماد والے معاملے میں اس نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ اس بات سے اس کے موروثی جائداد میں حصہ پانے پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ متعلقہ تاریخ پر اس کے والد زندہ تھے یا نہیں۔سپریم کورٹ کے مختلف اوقات میں دیئے گئے متضاد فیصلوں کے سبب یہ معاملہ متذکرہ بالا سہ رکنی بینچ کو بھیجا گیا جس نے اب یہ حتمی فیصلہ دیا ہے کہ ہر ہندو خاتون کو موروثی جائداد میں مشترکہ وارث ہونے کا حق جنم سے ہی حاصل ہوگا خواہ اس کے والد 2005 میں لائے گئے ترمیمی قانون کے وقت زندہ تھے یا نہیں ۔

حقوق وراثت اہل ہنود

آیئے اب ان قانونی نکات کا جائزہ لیتے ہیں جن کے مطابق ایک ہندو عورت اور دیگر وارثین کو کسی ایسے متوفی مرد کی جائداد میں، جس نے مرنے سے پہلے کبھی کوئی وصیت نہیں کی، کس طرح موروثی جائداد میں حصہ ملے گا۔

سب سے پہلے درجہ اول کے وارثوں کو حصہ ملے گا۔اگر درجہ اول کے وارث نہیں ہیں تو درجہ دوئم کے وارثوں کو حصہ ملے گا اور اگر درجہ دوئم کے وارث بھی نہیں ہیں تو یہ جائداد متوفی کے سلسلۂ نسب نرینہ (male lineage) کی رو سے اس کے سلسلہ ذکور میں یک جدی افراد (agnates) کو ملے گی۔اگر سلسلہ ذکور میں یک جدی افراد نہیں ہیں تو

رشتہ داران بسلسلۂ اناث یعنی مادری رشتہ داروں (cognates) کو دی جائے گی۔

درجہ اول و درجہ دوئم کے ورثاء کی تفصیل وراثت ہنود ایکٹ 1956 (Hindu Succession Act) میں شامل جدول (schedule) میں اس طرح دی گئی ہے:

اول درجہ کے ورثاء

1-بیٹا

2-بیٹی

3-بیوہ

4-ماں

5-متوفی کی زندگی میں فوت ہونے والے (pre-deceased) بیٹے کا بیٹا

6-متوفی کی زندگی میں فوت ہونے والے بیٹے کی بیٹی

7-متوفی کی زندگی میں فوت ہونے والے بیٹے کی بیوہ

8-متوفی کی زندگی میں فوت ہونے والی بیٹی کا بیٹا

9-متوفی کی زندگی میں فوت ہونے والی بیٹی کی بیٹی

10-متوفی کی زندگی میں فوت ہونے والے بیٹے کی زندگی میں فوت ہونے والے بیٹے کا بیٹا

11-متوفی کی زندگی میں فوت ہونے والے بیٹے کی زندگی میں فوت ہونے والے بیٹے کی بیٹی

12-متوفی کی زندگی میں فوت ہونے والے بیٹے کی زندگی میں فوت ہونے والے بیٹے کی بیوہ

درجہ دوم کے ورثاء

1-والد

2-(1) بیٹے کی بیٹی کا بیٹا (2) بیٹے کی بیٹی کی بیٹی (3) بھائی، (4) بہن

3-(1) بیٹی کے بیٹے کا بیٹا، (2) بیٹی کے بیٹے کی بیٹی (3) بیٹی کی بیٹی کا بیٹا (4) بیٹی کی بیٹی کی بیٹی

4-(1) بھائی کا بیٹا، (2) بہن کا بیٹا، (3) بھائی کی بیٹی، (4) بہن کی بیٹی

5-والد کے والد، والدہ کی والدہ

6-والد کی بیوہ، بھائی کی بیوہ

7-والد کے بھائی، والد کی بہن

8-والدہ کے والد، والدہ کی والدہ

9-والدہ کے بھائی، والدہ کی بہن

یاد رہے کہ وراثت ہنود ایکٹ 1956 کی دفعہ 25 کی رو سے قاتل یا قتل کی اعانت کرنے والا شخص حق وراثت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اس قانون کے نفاذ سے قبل یا اس کے بعد اپنا مذہب تبدیل کر لیتا ہے تو وہ بھی حق وراثت سے محروم ہو جائے گا۔

سپریم کورٹ نے تمام عدالتوں کو یہ حکم دیا ہے کہ تمام عدالتیں اس نظیر کی روشنی میں جلد از جلد تمام زیر التواء معاملات کا فیصلہ کریں۔

Khwaja Abdul Muntaqim

2-I.P Extn.

Delhi-110092

ہجر ناتمام

ڈاکٹر عشرت ناہید

اچانک ایک دن میں نے فیس بک پر دیکھا کہ میرے ایک مضمون پر کمنٹ میں کسی لڑکی نے طویل تبصرہ کیا جسے پڑھ کر مجھے لگا کہ یہ لڑکی پڑھی لکھی لگتی ہے پھر ایسا ہوا کہ میں نے اسی فیس بک پر میسیج میں اس کو لکھ دیا کہ آپ کے اس تبصرے کا شکریہ مگر میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں آپ سے بات کروں آپ اپنا ٹیلی فون نمبر براہ کرم مجھے بھیج دیں۔اس نے مجھے اپنا نمبر تو بھیج دیا لیکن جب میں نے اسے ٹیلی فون کیا تو اس نے میرا فون اٹھایا نہیں میں نے سوچا کہ بھئی مصروف ہوگی، گھنٹہ دو گھنٹہ بعد پھر فون کیا دوسرے دن پھر فون کیا لیکن اس نے ٹیلی فون نہیں اٹھایا، میں نے سوچا بدتمیز لڑکی ہے لیکن دوسرے دن اس نے مجھے میسیج کیا کہ میں اسے فون کرلوں، میں نے نہیں کیا۔

ایک دن سامنے مائکروفون رکھا تھا اس پر اس کی تصویر ابھر کر آئی۔ مجھے بڑی بھلی لگی ایک عرصہ دراز سے میں نے ایسی بھولی صورت دیکھی نہیں تھی کچھ صورتیں کم بخت ایسی ہوتی ہیں جو آنکھوں کے راستے سیدھے دل میں اتر جاتی ہیں۔ میں نے اپنے دل کو بہت منایا کہ یہ مت کرنا' کہ قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا' پھر گھنٹی بجی میں نے فون اٹھایا آواز ایسی لگی کہ پتھر کا جگر چیر کر جیسے جھرنا پھوٹے وہ کم بخت نامراد دل نصیحت دماغ سب بھول گیا اور مجھ سے مڑ کر کہنے لگا کہ اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک، سنو تو بھلا کون ہے جو اس آواز کو نظر انداز کردے۔

پھر اس کے ٹیلی فون پر ہوں ہاں کرتا رہا دوسرے اور پھر تیسرے ٹیلی فون پر کچھ باتیں اور ہوئیں تو کچھ اور پردے ہٹے، کچھ اور قربتوں کا اندازہ ہوا پھر اس کے بعد دو تین ٹیلی فون میں تو میں نے ایسا محسوس کیا کہ میں نے اس لڑکی کو دیکھا تو نہیں تھا آنکھوں میں وہی مائکروفون والی تصویر گھوم رہی تھی۔ لیکن ایسا محسوس ہوا کہ وہ جب بول رہی ہے تب آنکھوں کی حدت سے اس کی گرمی مجھ تک پہنچ رہی ہے پھر کیا تھا ٹیلی فون کے سلسلے چل پڑے پتہ چلا کہ دور دیس کی رہنے والی ہے۔

میں نے سوچا پہلے مل جاتی اب کیا کروں اور وہ جس طرح سے بات کر رہی تھی مجھے لگا کہ بہت زمانے سے مجھے اس کی تلاش تھی، میں نے سوچا مگر بہت دیر ہوگئی پھر خیال آیا کہ چلو آرزو جب بھی مجسم ہوجائے تو دیر نہیں ہوتی ورنہ حسرت میں بدل جاتی ہے اور ہوتا یہی ہے آرزو پوری قامت سے کھڑی ہو کر انگڑائی لے تو تمنا ہے اور خاک بسر ہو جائے تو حسرت ہے۔ پھر تو میرے دل میں خواہش ہوئی کہ میں اس سے ملوں لیکن اس سے پہلے پہلے مجھے پتہ چلا کہ وہ بہت پڑھی لکھی ہے مجھے ڈر سا ہوگیا کہ میں ٹھہرا نرا جاہل، علمی نادار، تہی دامن بھلا اس پڑھی لکھی سے کیا نمٹ سکوں گا اور اس پر اس نے ایک پتھر اور رکھ دیا کہ وہ مصر کانفرنس میں جارہی ہے میں نے کہا کہ الٰہی خیر یہ لڑکی اب مصر جائے گی۔

آہستہ آہستہ سارا راز کھلا دو چار ٹیلی فون کے بعد پتہ چلا کہ وہ تو ایک افسانہ نگار، کہانی کار نہیں بلکہ خود ایک کہانی ہے جو اپنے جلو میں ہزاروں کہانیاں رکھے ہوئے ہے کچھ کہی ہوئی سی کچھ ان کہی سی۔

پھر میں نے یہ بھی سمجھایا دل ناداں کو کہ رشتے اور بھی ہوتے ہیں قربتوں کے۔

پھر آہستہ آہستہ میں اسے پڑھنے کی کوشش کرتا رہا شروع میں تو وہ مجھے پڑھنے نہیں دیتی تھی مجھے بھی اندازہ تھا کتاب پڑھنا آسان نہیں ہوتا ہے خاص طور پر زندگی کی کتابیں۔ جب تک کہ کتاب خود کو پڑھوانے پر آمادہ نہ ہو اور جب میں نے اس کی کتاب کی ورق گردانی کی تو مجھے پتہ چلا کہ یہ تو غالب کے دیوان سے بھی مشکل کتاب ہے۔ غالباً طالب علمی کے زمانے میں غالب کا ایک شعر کبھی پڑھا تھا

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

میں زندگی بھر سوچتا رہا اب عمر کی شام ہونے کو ہے مگر آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا پہلا مصرعہ تو صاف ہے، دوسرے میں عبارت بھی سمجھ میں آگئی، اشارت بھی سمجھ میں آگئی لیکن یہ کمبخت لفظ 'ادا' آج تک سمجھ میں نہ آیا۔ جو غالب کا ایک شعر نہ سمجھ سکا ہو وہ بھلا یہ کتاب کیسے پڑھے یہ تو غالب کا مکمل دیوان لگتی ہے مجھے۔ اور ایسا لگا مجھے کہ یہ داستان صدیوں سے چل رہی ہے، اس کی وہی داستان جور و ظلم کی داستان، جبر کی داستان، اپنی مرضی سے کچھ نہ کر پانے کی داستان، شک کی داستان۔

ایک مرتبہ رات کی زلفیں دراز ہو چکی تھیں مگر پلکوں کی مسہری پر نیند اترنے کو آمادہ نہ تھی میں نے سوچا اب کیا ٹیلی فون کروں رات ہوگئی، پھر میں نے سوچا گھنٹی بجا کر تو دیکھ لیتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جب نیند روٹھی ہوئی ہو تو کسی سے بات کرنے کو جی چاہتا ہے۔ تنہائی یہی کرواتی ہے۔ میں نے ایک دو گھنٹیاں بجائیں ٹیلی فون بند کر دیا کچھ ہی دیر میں ادھر سے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، میں نے فون اٹھا لیا اور کہا

''سوئیں نہیں ابھی تک؟''

کہنے لگی ''نیند کہاں ان آنکھوں میں''

میں نے کہا ''خیر تو ہے؟ کیوں نیند نہیں''

تو کہنے لگی کہ ''جب خوابوں میں رہنے والی شہزادی کی آنکھوں میں سوئیاں چبھو دی جاتی ہیں تو پلکیں بند کہاں ہو پاتی ہیں کہ نیند آجائے۔ وہ اسی انتظار میں رہتی ہے کہ کوئی خوابوں کا شہزادہ آئے اور اس کی آنکھوں کی سوئیاں نکال دے لیکن اس کے آنے میں بڑی دیر ہو جاتی ہے اور سوئیاں زنگ آلود ہو جاتی ہیں۔'' میں نے آہستہ سے موضوع بدلا۔

تب ہی مجھے پتہ چلا تھا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے اس کے دو بچے ہیں میں نے کہا کہ ''تم مصر جا تو رہی ہو اتنے اونچے مقام پر فائز ہو، کیا تمھارے شوہر بھی پروفیسر ہیں؟''

''نہیں وہ تو بزنس کرتے ہیں۔''

میں نے سوچا ادب اور تجارت کا کیا جوڑ پھر خیال آیا کہ پتہ نہیں کتنے دکھ ہیں آواز میں بھی کچھ ایسا تاثر لگتا ہے جیسے ستار کا کوئی تار ٹوٹ گیا ہے۔

میں نے پوچھا کہ ''ایک بات پوچھوں ؟''

وہ کہنے لگی ''ہاں ہاں پوچھیے۔''

میں نے کہا ''نہیں خیر جانے دیجیے۔''

وہ بولی ''پوچھیے ناں؟''

''نہیں وہ وہ میں ذرا سا۔''

''نہیں نہیں جھجکنے کی ضرورت نہیں پوچھیے آپ۔''

''تم جو یہ ترقی کے زینوں پر زینے طے کرتی ہوئی اوپر چڑھتی جا رہی ہو اور بہت اوپر پہنچ گئی ہو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تمھارے شوہر کو برا معلوم ہو؟''

'اس نے بڑی صفائی سے مجھے کہہ دیا کہ ہاں یہ ہوتا ہے اور مجھے احساس ہوا کہ یہ اندر سے ٹوٹ کر رہ گئی ہے اور جب مجھے مقابل میں کوئی ٹوٹا نظر آتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ پھر جڑ تو نہیں پائے گا اور یہ جہاں تک ٹوٹا ہے اسے وہیں تک رکھا جائے۔ جوڑنے کی کوشش نہ کی جائے مزید بکھرنے نہ دیا جائے۔ پھر تعلقات و روابط بڑھتے چلے گئے۔ لیکن میں نے دیکھا نہیں تھا اسے۔ وہ مصر گئی اس نے تاثرات لکھے میں پڑھتا رہا پھر ایک دن میں نے اس سے کہا کہ 'میں آرہا ہوں تمہارے شہر'' اس نے بے ساختہ 'خوش آمدید' اھلاً و سھلاً مرحبا کہا اس کے لہجے میں مسرت تھی، پہلی مرتبہ لہجے میں ایک نئی کھنک سی تھی۔'

ایک لمحے کے لیے وہ چپ رہی۔

میں سوچنے لگا کہ وہ کہے گی کہ نہیں وہ تو میرے ساتھ بڑی محبت سے پیش آتے ہیں کہتے ہیں تم اور آگے بڑھو میں تمھارے پیچھے ہوں، ساتھ ہوں۔

لیکن اس نے کہا کہ" ہاں یہ تو ہوتا ہے نا کہ عورت جب بڑھتی چلی جاتی ہے اور مرد پیچھے رہتا ہے تو اس کی آنکھوں میں بہت ساری ایسی چیزیں دکھائی دیتی ہیں کہ عورت اب لوٹنا چاہے بھی تو لوٹ نہیں سکتی اور آگے بڑھنے میں پاؤں کی زنجیریں ہٹ جاتی ہیں۔"

اس نے بڑی صفائی سے مجھے کہہ دیا کہ ہاں یہ ہوتا ہے اور مجھے احساس ہوا کہ یہ اندر سے ٹوٹ کر رہ گئی ہے اور جب مجھے مقابل میں کوئی ٹوٹا نظر آتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ پھر جڑ تو نہیں پائے گا اور یہ جہاں تک ٹوٹا ہے اسے وہیں تک رکھا جائے۔ جوڑنے کی کوشش نہ کی جائے مزید بکھرنے نہ دیا جائے۔ پھر تعلقات و روابط بڑھتے چلے گئے۔ لیکن میں نے دیکھا نہیں تھا اسے۔ وہ مصر گئی اس نے تاثرات لکھے میں پڑھتا رہا پھر ایک دن میں نے اس سے کہا کہ 'میں آرہا ہوں تمھارے شہر' اس نے بے ساختہ 'خوش آمدید' اہلاً و سہلاً مرحبا کہا۔ اس کے لہجے میں مسرت تھی، پہلی مرتبہ لہجے میں ایک نئی کھنک سی تھی۔

میں گیا تو جس کو دیکھنے کے لیے میری آنکھیں انتظار میں کھلی کی کھلی رہتی تھیں میں نے اسے دیکھا کہ جب میں قریب گیا تو وہ خود شدت سے میری منتظر تھی۔ میں ملا۔ وہ باتیں کرتی رہی، ہر لفظ سے خوشی ہی نہیں بے پناہ خوشی جھلک رہی تھی، سب کچھ پا لینے، ایک سرشاری کی کیفیت تھی اس کی لیکن جانے کیوں لگا مجھے کہ وہ بہت دور سے بول رہی ہے۔

'اسے دیکھ کر میں نے سوچا کہ میں تو سمجھا تھا کہ گوری ہوگی بانکی ہوگی مگر یہ تو سانولی نکلی تو پھر مجھے میرے اندر سے آواز آئی کہ دن تو بڑا روشن روشن رہتا ہے کبھی شام کی بھی سوچی ہے شام سانولی نہ ہو تو شام کیسی پھر شام کا حسن کیسا؟'

اسے دیکھ کر میں نے سوچا کہ میں تو سمجھا تھا کہ گوری ہوگی بانکی ہوگی مگر یہ تو سانولی نکلی تو پھر مجھے میرے اندر سے آواز آئی کہ دن تو بڑا روشن روشن رہتا ہے کبھی شام کی بھی سوچی ہے شام سانولی نہ ہو تو شام کیسی پھر شام کا حسن کیسا؟

سگریٹ پر سگریٹ پینا میری عادت تھی جتنی دیر بیٹھا رہا میں نے سگریٹ نہیں جلائی اسے خود خیال آیا کہ میں باتوں میں اس سے سگریٹ نوشی کا ذکر بارہا کر چکا تھا وہ جانتی تھی کہ سگریٹ کے بنا میرا وجود ادھورا ہے اس نے کہا کہ

"آپ سگریٹ پی سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "عموماً میں کسی کے گھر سگریٹ نہیں پیتا"

اس لمحے اس کی آنکھوں میں ایک شکوہ سا اترتا محسوس ہوا اور میں نے سگریٹ جلالی، دو کش لینے کے بعد دھویں کے مرغولے میں مجھے اس کی جو شبیہ دکھائی دی اس میں اس کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آئی اور میں جانے کیا سوچ کر مسکرادیا۔

لیکن ایسا لگتا تھا کہ دھوئیں میں بھی مجھے کسی کی تلاش تھی ایک ادھوراپن، کچھ مل جانے پر بھی کھو دینے کا گمان، عجب بے اطمینانی سے دوچار تھا میں۔

میں نے اس کو نظر بھر کر دیکھا ، اٹھ کھڑا ہوا اس کی طرف دو قدم بڑھا اور بے اختیار اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بیٹی جگ جگ جیو، تمھاری کلائیوں میں سہاگ کی چوڑیاں کھنکتی رہیں۔"

میں لوٹ آیا تھا اس راہ گزر سے اور سوچ رہا تھا کہ مرد تو نامراد ایک کم بخت پہیلی ہے ایسی جس کا بوجھ ہے اپنا سب کچھ آگے کو رکھ دیتا ہے کہ کتاب زیست پڑھ لو لیکن عورت تو ایک معمہ ہے ایسا جس کا کوئی حل ہی نہیں ہوتا۔ اس دائمی ہجر زدہ ذات کو وصال کے لمحوں کی تلاش تو تھی ہی نہیں، اس کے قلم کو تو روانی ہی ہجر نے بخشی ہے کریدتے ہو جواب راکھ جستجو کیا ہے۔ سو پلٹ آیا میں دور بہت دور۔

❑❑❑

Dr. Ishrat Naheed
Asst. Professor
Maulana Azad National Urdu University,
Lucknow Campus
504/122 Taigore Marg
Near Shabab Market
Lucknow-226 020 (U.P)

شیشے کا گھر

ڈاکٹر حنا شمائم

مسرت آج بہت خوش تھی۔ اس کی خوشی کی وجہ یہ تھی کہ اس کو شہر کے ایک اچھے کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔ کچھ دنوں میں کلاسیز بھی شروع ہونے کو تھیں۔ساتھ ساتھ اسے اس بات کا افسوس بھی تھا کہ اس کی سہیلیاں اس سے بچھڑ رہی تھیں۔ وہ بہت شوق سے آگے کی پڑھائی کرنے کی تیاری میں مصروف تھی۔ ساتھ ہی اپنی پسند کے لباس بھی خرید رہی تھی۔ گھر میں سبھی لوگ بہت خوش تھے اور اس کے شوق کو پورا کر رہے تھے۔وہ دو بھائیوں کی لاڈلی بہن جو ٹھہری۔ وہ جو فرمائش کرتی وہ پوری کی جاتی لیکن اس نے کبھی اس کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے آج کل کے فضول فیشن کو کبھی نہیں اپنایا۔ وہ ہمیشہ تہذیب کے دائرے میں رہتی اور اس کا برتاؤ بھی لوگوں کے ساتھ شائستہ رہتا۔ پڑھائی کے ساتھ گھر کے کاموں میں بھی حصہ لیتی۔ سیرت کے ساتھ اللہ نے اسے صورت بھی بہت پیاری دی تھی۔ ابا اور امی دونوں کو اس پر فخر محسوس ہوتا تھا۔

کچھ دنوں بعد اس نے کالج جانا شروع کر دیا۔ پڑھائی کرنے میں اس کو بہت مزہ آ رہا تھا۔ وہ ایک دن بھی کالج ناغہ نہیں کرتی تھی۔ کالج سے آ کر سبھی لیکچرز کو پڑھ کر سمجھ کر نوٹس بناتی۔ کلاس میں کوئی بھی سوال کیا جاتا اس کا جواب دیتی ٹیچرز بھی اسے مانتی تھیں اور یہاں اس کی کچھ دوست بھی بن گئی تھیں جو اس کی قدر کرتی تھیں۔ اس کی کلاس نو بجے شروع ہو جاتی تھی اس لیے سوا آٹھ تک وہ گھر سے نکل جاتی تھی۔ بہت اچھا وقت گذر رہا تھا۔

مگر آج وہ گھر سے کچھ آگے بڑھی ہی تھی کہ لگا کوئی اس کے پیچھے آ رہا ہے اس نے دھیان نہیں دیا لیکن کچھ دیر بعد جب مڑ کر دیکھا تو ایک نوجوان اس کے پیچھے تھا۔ دیکھنے میں تو اچھے گھر کا لگ رہا تھا۔ وہ اس کو نظر انداز کرتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ جب کالج سے واپس آ رہی تھی تب بھی وہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ گھر آ کر وہ پریشان تھی پھر اس کے خیال کو اس نے اپنے ذہن سے جھٹکنے کی بہت کوشش کی لیکن اس کا خیال آ ہی جاتا تھا۔

دوسرے دن بھی وہی ہوا۔ اب مسرت بہت پریشان رہ رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی ہو۔ وہ جیسے ہی کالج سے نکلتی وہ نوجوان اس کا پیچھا کرتا کبھی کچھ فقرے کستا تو کبھی چلتے چلتے کافی نزدیک آ جاتا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اچھے گھر کا لگتا ہے لیکن حرکتیں کتنی گھٹیا ہیں وہ الجھن میں تھی کہ کسی کو بتائے یا نہ بتائے پھر اس نے سوچا کہ کچھ دن اور دیکھ لوں۔ اس کے بعد بھی اس کا یہی رویہ رہا تو گھر میں بتاؤں گی۔ امی نے بھی ایک دن اس کو ٹوک دیا۔

کیا بات ہے مسرت تم آج کل کچھ پریشان رہ رہی ہو۔ نہیں امی ایسی کوئی بات نہیں ہے کہہ کر اس نے بات ختم کر دی۔ لیکن امی اس کی پریشانی کو بھانپ کر خود بھی پریشان تھیں اور ہر نماز کے بعد اس کے لیے دعائیں کرتیں۔ دو دنوں بعد اس کے سہ ماہی امتحانات شروع ہونے والے تھے جن کی تیاری اس نے بہت محنت سے کی تھی۔ اس کے سارے پیپرز اچھے ہو رہے تھے۔ آج آخری پیپر تھا جو کہ بہت اچھا ہوا تھا وہ خوش خوش

کالج سے واپس آ رہی تھی اچانک اس نے محسوس کیا وہ آدمی پھر اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ آگے راستہ تھوڑا سنسان بھی تھا۔ وہ کچھ بولتا بھی جا رہا تھا جس پر وہ دھیان نہیں دے رہی تھی۔ پھر اس شخص نے اپنی رفتار بڑھا دی اور مسرت کے بالکل نزدیک آ گیا۔ آج اس کو بہت خوف محسوس ہوا۔ اچانک مسرت کو رخسانہ کا خیال آیا بس آگے والی گلی میں ہی اس کا گھر تھا۔ رخسانہ اسکول میں مسرت کے ساتھ پڑھتی تھی بعد میں دونوں کے کالج الگ ہو گئے تھے۔ وہ مزاج کی بہت اچھی تھی۔ بس بنا کچھ سوچے سمجھے اس نے رخسانہ کے گھر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ رخسانہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ مسرت نے رخسانہ کو ساری باتیں بتا دیں اور بولی کہ بھائی جان کو فون کر کے بلا لیتی ہوں ان کے ساتھ چلی جاؤں گی ۔ رخسانہ نے مسرت کو سمجھایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میرے بھیا بس آتے ہی ہوں گے وہ تم کو گھر تک چھوڑ دیں گے۔ اتنے دنوں بعد ہم ملے ہیں چلو گزرے ہوئے وقت کو یاد کرتے ہیں۔ رخسانہ کی امی بھی بولیں کہ ہاں شمشاد آتا ہی ہوگا وہ تم کو پہنچا دے گا۔ مسرت کو بھی اطمینان ہوگیا۔ لیکن اس نے امی کو خبر کر دی کہ میں رخسانہ کے یہاں ہوں آنے میں کچھ دیر ہوگی رخسانہ کی چھوٹی بہن شبانہ بھی مسرت سے مل کر بہت خوش تھی۔ سب نے ساتھ مل کر کھانا کھایا اور پھر پرانی باتیں یاد کرتے ہوئے گفتگو میں مشغول ہوگئیں۔ رخسانہ اپنی امی اور شبانہ کو مسرت کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کے بارے میں مزے لے لے کر بتا رہی تھی۔ پھر اپنی دوسری نئی دوستوں کے بارے میں دونوں ایک دوسرے کو بتانے لگیں۔ رخسانہ کی امی نے اس کے گھر والوں کے بارے میں پوچھا اور انھیں سلام کہنے کو کہا۔ رخسانہ کو باغبانی کا بہت شوق تھا وہ مسرت کو اپنا باغیچہ دکھانے لے گئی مسرت کو بھی بہت اچھا لگا۔ دو گھنٹے کس طرح گزر گئے پتہ ہی نہ چلا۔

'تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی رخسانہ نے دروازہ کھولا اور بولی لو بھیا آ گئے ۔آئیے بھیا میری سہیلی مسرت سے ملیے - ہم لوگ اسکول میں ساتھ تھے - مسرت نے جیسے ہی رخسانہ کے بھیا کی طرف دیکھا اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی ۔ یہ تو وہی شخص تھا جس سے ڈر کر وہ یہاں آئی تھی۔اچانک اس نے اپنا موبائل نکالا امی کو کال کیا اور بولی امی میں رخسانہ کے گھر سے نکلنے والی ہوں- برائے مہربانی بھائی جان کو بھیج دیجیے مجھ کو لینے کے لیے۔'

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی رخسانہ نے دروازہ کھولا اور بولی لو بھیا آ ہی گئے۔ آئیے بھیا میری دوست مسرت سے ملیے۔ ہم لوگ اسکول میں ساتھ تھے۔ مسرت نے جیسے ہی رخسانہ کے بھیا کی طرف دیکھا اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ یہ تو وہی شخص تھا جس سے ڈر کر وہ یہاں آئی تھی۔ اچانک اس نے اپنا موبائل نکالا امی کو کال کیا اور بولی امی میں رخسانہ کے گھر سے نکلنے والی ہوں۔ برائے مہربانی بھائی جان کو بھیج دیجیے مجھ کو لینے کے لیے۔ پھر وہ رخسانہ کے بھیا شمشاد سے مخاطب ہو کر بولی آپ کے پاس بھی بہنیں ہیں جو لوگ خود شیشے کے گھر میں رہتے ہوں کم از کم انھیں تو دوسروں کے مکان پر پتھر نہیں پھینکنا چاہیے۔ آپ جیسے لوگ ہی ہماری قوم کی لڑکیوں کی ترقی میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ آپ جیسے لوگوں کی وجہ سے ہی ماں باپ اپنی بیٹیوں کو اسکول کالج نہیں بھیجنا چاہتے۔ آپ جیسے لوگوں کی حرکتیں لڑکیوں کی بدنامی کا باعث بنتی ہیں۔ وہ اپنی بدنامی کی وجہ سے خاموش رہ جاتی ہیں اور آپ لوگ اس کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں آپ کے خوف سے یہاں آئی تھی لیکن اب مجھے آپ سے کوئی خوف نہیں محسوس ہو رہا ہے کیونکہ آپ بھی اسی کشتی پر سوار ہیں جس پر میں ہوں یا اور لڑکیاں ہیں لیکن آپ کو اس بات کا احساس نہیں ہے۔ شمشاد کا سر اپنی ماں بہنوں کے آگے ندامت سے جھک گیا۔ مسرت کا جملہ سن کر شمشاد کی ماں بہنوں کو بھی ساری بات سمجھ میں آ گئی اور انھوں نے نفرت سے شمشاد کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ مسرت کو ایسا لگا جیسے اس نے اس شخص سے بدلہ لے لیا ہو۔ اس کے دل کو ایک سکون ملا۔ اس نے رخسانہ، شبانہ اور ان کی امی کی طرف دیکھتے ہوئے اللہ حافظ کہا اور وہاں سے نکل گئی۔ رخسانہ شرمندگی کی وجہ سے کچھ کہہ نہ سکی اور بس خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اس کے دوپٹے میں جذب ہو رہے تھے اور ان آنسوؤں کی وجہ اس کے بھائی شمشاد کی حرکتیں تھیں۔

□□□

Dr. Hena Shamayem
M.B.B.S. D.G.O
Alam Clinic
Kaghzi Mohalla
Bihar Sharif
Nalanda-803101 (Bihar)

آسیہ رئیس خان

خاکی چھتری

آسمان پر ابر نے انگڑائی لی اور اس کی آغوش میں دبکی بوندوں نے نیچے جھانکا۔ جہاں پیاس کی انتہا پر منھ سے نکلی خشک زبان کی طرح پھیلی دھرتی بمشکل سانسیں کھینچتی بڑی آس سے انھیں تک رہی تھی۔ نمی کی چاہ میں اس نے جا بجا اپنا دامن چاک کر رکھا تھا تو کہیں بے آبی خاک اڑا رہی تھی۔ بوندوں نے پلکیں جھپکائیں اور مسکراتے ہوئے مشفق ماں کی طرح زمین کو سیراب کرنے قطار در قطار باہر کود پڑیں۔ پانی کو اپنے اندر سموتے ہی بے دم زمین جھوم اٹھی اور ادھر صبح سے کراہ کر گھوم رہے پنکھے کو گھورتی سیما دل تھام کر بیٹھ گئی۔ پہلی بارش میں پانی اور پیاس کا یہ وصل اس کے دل میں وہ تباہی مچاتا تھا جو اس موسم میں کچی بستی ڈھہ جانے پر برپا ہوتی ہے۔ بے سروسامانی، کیچڑ میں پھسلتا وجود اور ہر سو خاکی رنگ۔ آنکھوں سے بہتا پانی، فرش پر پھیلا پانی، مٹی میں ملتا پانی، سب جگہ خاکی پانی۔ اس کا وجود بھی اس بارش میں تحلیل ہو کر اسی رنگ کا ہو جاتا تھا۔ پگھلتے بادلوں کی ایسی ہی ایک شام میں یہ رنگ اس کے لیے درد سے تعبیر ہو گیا تھا۔

کالج کا آخری سال تھا یعنی حادثات کا دور اور واردات کی عمر میں وہ کسی انہونی کے بغیر ہی فائنل میں پہنچ گئی تھی۔ خود کو مریضِ عشق کہنے والے کئی جوڑے کالج کے کونوں کھدروں، لائبریری اور کینٹین کو رنگین کیے ہوئے تھے۔ کالج میں محبت کا مظاہرہ کرتے ایسے ہر نظارے پر سیما کا اپنا فتویٰ موجود تھا۔ جسے وہ اپنے 'اصول و آئیڈیل' کہتی تھی اور بقول اس کی سہیلیاں یہ اس کے 'نخرے' تھے۔ جبکہ چندا کا کہنا تھا کہ محبت میں پرانی ہیروئینوں والی انا، عزتِ نفس، خودداری، لڑکی کا پہل نا کرنا جیسے آوٹ ڈیٹیڈ ڈائیلاگز اس دور کی کتابوں میں دستیاب نہیں اور عملی زندگی میں تو ان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ یہ بھی نہیں تھا کہ سیما محبت سے انکاری تھی، وہ محبت میں لٹ جانے تک کو تیار تھی لیکن اپنی گردن اکڑا کر۔

محبت بھی قضا کی طرح اٹل ہے۔ ایک بار اس کا وقت آ جائے تو کسی طرح ٹل نہیں سکتی۔ سیما کے لیے یہ وقت دوسرے شہر سے مائیگریٹ ہو کر آئے امن کی آمد تھا۔ پہلا تصادم، کچھ تکلم اور چند ملاقات بھم اور اس کے سینت اور سینچ کر رکھے 'نخرے' ایک وجود کی تپش سے بھاپ بن کر اڑ گئے۔ ان دونوں کی دوستی اور بڑھتی قربتیں ان کے حلقۂ احباب کو بھی حیرت میں ڈالے ہوئے تھی۔ سیما عام سی لڑکی تھی جبکہ امن بلاشبہ خوبرو اور اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے قلیل وقت میں ہی کالج کا نمایاں طالب علم بن چکا

تھا۔ کئی لڑکیاں امن کے نام پر برملا آہیں بھرتی تھیں۔ اس 'نخرے والی لڑکی اور لڑکیوں میں 'ان ڈیمانڈ' لڑکے کی دوستی پر چہ میگوئیاں بھی ہوتی تھیں۔ ایسی سرگوشیوں اور سوالیہ نظروں پر وہ دل میں انھیں مخاطب کرتی۔

'وہ کسی سے کچھ کہے اور ملے بغیر ہی وہ شہر چھوڑ کر گھر چلی گئی۔ اتفاقاً اس کے والد کے دوست نے کسی شہر میں نیا اسکول شروع کیا تھا انہیں اساتذہ کی ضرورت تھی۔ سیما اسی ہفتے ان کے اسکول آگئی۔ آنے سے پہلے اس نے گھر میں بتایا تھا کہ کوئی لڑکا کالج میں اسے پریشان کرتا تھا، ہوسکتا ہے وہ کسی طرح اس کا فون نمبر یا پتا حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ آگے گھر والوں نے خود ہی سمجھ کر سب سنبھال لیا تھا۔ وہ اب کبھی چندا اور امن کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔'

''بے وقوف! محبت میں برابری فقط جذبات اور احساسات کی لازمی ہے۔'' باقی سب بے معنی ہے۔ جلد ہی ان کے احساسات الفاظ و زبان کی محتاجی سے آگے بڑھ گئے۔ سب کے درمیان معمول کی گفتگو کے دوران امن بند سیپیوں جیسے اشارے چھوڑ جاتا، جن سے گوہر نکال کر وہ اپنی تنہائیاں سجائے رکھتی۔ اس کے دل میں اٹھتی محبت کی موجیں جلد ہی سونامی میں تبدیل ہو کر اس کی ساری فلاسفی بہالے گئی تھی۔ اس کے اصول اور آئیڈیل 180 ڈگری ٹرن لے چکے تھے۔ ان کا کالج چھوڑنے کا وقت آ گیا تھا لیکن امن مزید کورسز کی خاطر اسی شہر میں رکنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ گھر جانے سے پہلے درمیان کا وہ پردہ گرا دینا چاہتی تھی جس کے پیچھے وہ ایک دوسرے کے دوست نہیں محبوب تھے۔

کل اسے گھر جانا تھا۔ ان دونوں کے درمیان کی ان کہی کو لفظوں کا پیرہن دینے میں وہ پہل کرنے کو تیار تھی۔ وہ اس کی منتظر تھی اور موسم کی پہلی بارش شروع ہوگئی۔ وہ اپنی گھڑی اور کافی ہاؤس کا داخلی دروازہ دیکھتی رہی لیکن امن نہ آیا۔ وہ فون بھی نہیں اٹھا رہا تھا۔ اس کے دوستوں کو بھی اس کی خبر نہیں تھی۔ وہ کافی ہاؤس بند ہونے تک وہاں اس کا انتظار کرتی رہی تھی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے اور سوتے ہوئے گزارنے کے بعد دن نکلتے ہی، بارش کی پرواہ نا کرتے ہوئے وہ چندا سے ملنے چلی آئی۔ اس نے امن کے متعلق اب تک خود کو عقلِ کل سمجھ کر سارے فیصلے کیے تھے۔ پہلی بار اسے خیال آیا کہ امن سے بات کرنے سے پہلے اس معاملے میں اپنی جگری اور عقلمند چندا سے مشورہ کرنا چاہیے۔ چندا کالج کے قریب دوسری دو لڑکیوں کے ساتھ کمرہ لے کر رہتی تھی۔ اس کی روم میٹ نے بتایا کہ وہ ابھی آئی ہے اور غسل خانے میں ہے۔

''ابھی آئی ہے مطلب؟ رات میں کہاں تھی؟''

پتہ نہیں۔ وہ باہر نکلے تو تم ہی پوچھنا، بیٹھو۔ اس کے اشارے پر کرسی پہ بیٹھتی سیما کی نظر سامنے چندا کے پرس کے ساتھ رکھی چھتری پر پڑی اور چشمِ زدن میں اس کے ارمانوں کی بستی طوفان کی زد میں آ گئی۔ یہ وہی چھتری تھی جو اس نے امن کو دی تھی۔ دوکان میں نیلی پیلی اور لال ہری چھتریوں کے درمیان وہ خاکی رنگ کی چھتری اسے اس لیے بھی منفرد لگی تھی کہ اس کے ہینڈل پر انگریزی حروف اے اور ایس کندہ تھے۔ اس دن پہلی بار بارش کے پانی کے ساتھ اس کا وجود تحلیل ہو کر خاکی ہوا تھا۔

وہ کسی سے کچھ کہے اور ملے بغیر ہی وہ شہر چھوڑ کر گھر چلی گئی۔ اتفاقاً اس کے والد کے دوست نے کسی شہر میں نیا اسکول شروع کیا تھا انھیں اساتذہ کی ضرورت تھی۔ سیما اسی ہفتے ان کے اسکول آ گئی۔ آنے سے پہلے اس نے گھر میں بتایا تھا کہ کوئی لڑکا کالج میں اسے پریشان کرتا تھا، ہوسکتا ہے وہ کسی طرح اس کا فون نمبر یا پتا حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ آگے گھر والوں نے خود ہی سمجھ کر سب سنبھال لیا تھا۔ وہ اب کبھی چندا اور امن کی شکل نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

دل میں محبت کا رستہ یک طرفہ ہے۔ اس کی محبت بھی اب مقبرے میں دفن تھی۔ لیکن اس مُرقد پر پچھتاوؤں کے بین نہ تھے، عزتِ نفس کی پامالی کا نوحہ نہ تھا۔ یہاں اپنا پندار سلامت رہ جانے کے شکرانے تھے۔ یہ مقبرہ جدائی کی علامت تھا۔ ایک ایسا مقبرہ جہاں درد اور اداسی کے ساتھ یک گونہ سکون بھی بستا ہے۔ چندا نے جو بھی کیا ہو لیکن اسے اس بات پر فخر تھا کہ اس نے اپنی دوست کو شرمندہ نا کر کے اپنی جانب سے دوستی نبھائی تھی۔ وہ لٹ گئی تھی لیکن اس کی گردن تنی تھی۔ اس کے خیالات اب واپس 360 ڈگری ٹرن لے چکے تھے۔ وہ شاکر تھی کہ اس کے جذبے سہوِ اظہار سے بچ کر اب بھی انمول ہی تھے، گویائی سے محرومی نے اس کے احساسات کو ختم نہیں کیا تھا اور اس کی انا اور عزت نفس اس خاکی چھتری نے سلامت رکھی تھی۔ قدرت نے اسے موقع دیا تھا کہ وہ صبح امن کے پاس جانے کی بجائے چندا کی طرف گئی تھی۔

''ماں اب چلیں ناں، بارش بند ہوگئی ہے۔'' پیچھے سے اس کے چھ

سالہ بیٹے نے آواز لگائی تو وہ بھیگی پلکیں خشک کرتی پلٹی۔

''ہاں چلو۔'' اس کے بیٹے کو اپنے بابا کی سالگرہ کے لیے تحفہ لینا تھا۔ وہ دونوں باہر جانے کے لیے تیار ہوئے ہی تھے کہ بارش نے انھیں روک دیا تھا۔

گھر سے باہر نکلے تو گلی میں سامان سے لدا ٹرک کھڑا تھا۔ پیشہ ور 'پیکرز اینڈ موورز' والے ٹرک سے بڑے بڑے کارٹن نکال رہے تھے۔

''لگتا ہے سامنے والے خالی مکان میں کوئی رہنے آگیا ہے۔'' بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھتے ہوئے اس نے سوچا تبھی اس آواز نے اس کے قدم روک دیے۔

''سنبھل کر بھیا، اس میں کانچ کا سامان ہے۔'' وہ پلٹنا نہیں چاہتی تھی لیکن اس آواز نے ریموٹ کا کام کیا اور وہ روبوٹ کی طرح پلٹی۔ مزدور کو ہدایت دیتی چندا کی نظر اس پر پڑی تو اس کا منہ کھلا رہ گیا پھر وہ چیخ مارتی ہوئی دوڑ کر اس سے لپٹ گئی۔

''کہاں غائب ہوگئی تھی تم؟ ایسے کوئی کرتا ہے؟'' چندا نے زور سے اس کی کمر پر ہاتھ مارا۔ وہ رو رہی تھی اور سیما نے سوچا۔

''کیا اسے اپنے کیے کا احساس ہے؟''

''تم بھی یہیں رہتی ہو، اسی محلے میں؟'' سیما نے سر ہلا کر جواب دیا۔

''ہاں۔۔۔ اگر یہ اتفاق نا ہوتا تو شاید ہم ملتے ہی نا۔ بہت غصہ ہوں میں تم سے اور وہ۔۔۔۔۔''

''ممی! پاپا آپ کو اندر بلا رہے ہیں۔'' خالی مکان کے دروازے سے اس کے بیٹے کی ہم عمر لڑکی نے باہر آکر پکارا۔

''یہ میری بیٹی ہے۔ تمھارا بیٹا بھی بڑا پیارا ہے۔'' چندا نے سیما کے بیٹے کے گال چھو کر کہا۔

''بیٹا پاپا کو باہر آنے کے لیے کہو۔'' اس نے مڑ کر اپنی بیٹی سے کہا۔ سیما کی دھڑکنیں بے ہنگم ہوگئیں۔

''ابھی تم مصروف ہو، فرصت میں ملتے ہیں۔'' اس نے وہاں سے بھاگنے کی سعی کی۔

''ملنا ملانا تو اب ہوتا ہی رہے گا۔۔۔۔۔۔ رکو۔۔۔۔'' درمیانے سائز کا کارٹن اٹھا کر لے جا رہے مزدور کو چندا نے آواز دے کر روکا۔ سیاہ مارکر سے اس پر 'کالج' لکھا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے کھولا اور ادھر ادھر ہاتھ مارنے کے بعد مطلوبہ چیز باہر نکالی۔ جسے دیکھتے ہی سیما نے تڑپ کر دعا کی کہ باہر آنے والا چندا کا شوہر امن ہی ہو۔

''تمھیں یاد تو ہوگی یہ چھتری۔ میں نے کتنی بار امن کو لوٹانے کی کوشش کی لیکن ہر بار اس کا ایک ہی جواب تھا کہ جس دن سیما مل جائے گی تم سے مانگ لوں گا اور مجھ سے پہلے اگر تمھیں مل جائے تو تم لوٹا دینا۔ تمھیں تو یہ بھی علم نہیں کہ یہ میرے پاس کیسے آیا'' چندا بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے بھی تو بوجھ اتارنا تھا۔'

''تمھیں یاد تو ہوگی یہ چھتری۔ میں نے کتنی بار امن کو لوٹانے کی کوشش کی لیکن ہر بار اس کا ایک ہی جواب تھا کہ جس دن سیما مل جائے گی تم سے مانگ لوں گا اور مجھ سے پہلے اگر تمھیں مل جائے تو تم لوٹا دینا۔ تمھیں تو یہ بھی علم نہیں کہ یہ میرے پاس کیسے آیا'' چندا بڑی گہری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے بھی تو بوجھ اتارنا تھا۔

''جس شام وہ تم سے ملنے آ رہا تھا بارش کی وجہ سے اسے آٹو نہیں مل رہا تھا، مجھے بھی ادھر ہی جانا تھا سو میں نے اسے اپنے آٹو میں لفٹ دی تھی۔ راستے میں آٹو کا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ مجھے تو چوٹ نہیں آئی تھی لیکن اسے کافی چوٹیں آئیں تھی۔ اس کا فون بھی ایکسیڈنٹ کی جگہ ہی کہیں چھوٹ گیا تھا اور میرا فون ٹوٹ گیا تھا۔ مجھے امن نے تمھیں اطلاع دینے سے روکا تھا کہ تم پریشان ہو جاؤ گی اور بارش کے باوجود رات میں ہی ہسپتال پہنچنے کی کوشش کروگی'' وہ ذرا ٹھہری۔ ''سیما وہ اب بھی۔۔۔۔۔''

''چندا!'' عقب سے اس کے شوہر نے پکارا۔

''ساحل یہ میری فرینڈ ہے، آئیں نا ملیں اس سے۔''

چندا کے ہاتھ سے وہ ملگجی پرانی خاکی چھتری لیتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اندر مقبرے میں اب سکون نہیں تھا۔ وہاں بین شروع ہوگئے تھے اور سیما کی گردن جھکی تھی۔

□□□

Aasiya Raees Khan
70-B Roshan Heights
Plot No 42,Sector 40
Seawoods
Navi Mumbai-400706 (M.S)

ابوبکر عباد

رب بھی تیرے جیسا ہے ماں

شیریں نرمل جھرنے جیسی
ٹھنڈی تازہ ہوا کے ایسی
رم جھم اور برکھا کی طرح تو
سورج اور چندا سی تجی ہے
جلتی دھوپ میں بادل ہے تو
رب کے پیار کی چھاگل ہے تو
ہاں ماں! بالکل ایسی ہے تو
تو سیتا تو مریم ہے ماں
رابعہ اور صفورہ ہے
تو ہے یشودھا تو ہے حلیمہ
زینب تو ہے فاطمہ ہے تو
پاروتی اور دیوکی ہے
آمنہ اور حوا ہے تو
یہ دھرتی یہ دنیا تجھ سے
دنیا کی سب رونق تجھ سے
تو دنیا کی مالک ہے
یہ دنیا تیری ہے ماں
تو نے ہم کو کیا کیا بخشے
پیر پیمبر بھائی دوست
اور پھولوں سی بہنا دی
ہر سکھ اور ہر غم کی ساتھی
بالکل اپنی ہی جیسی
محبوبہ بھی تو نے دی
تو سچ مچ دیوی ہے ماں
سارے رشتے ناتے تجھ سے
رشتوں کی جننی ہے تو
ہاں ماں! بالکل ایسی ہے تو

تو ہے کریم اور تو ہے حلیم
خالق تو ہے رازق ہے تو
ستاری غفاری تجھ میں
رحمت اور عظمت کی مورت
رب کے سارے گن ہیں تجھ میں
ماں! بالکل تو رب جیسی ہے
یا شاید رب تیرے جیسا
کیوں کہ ماں اب رب بھی تو
تیری طرح مجبور بہت ہے
اپنوں کے زخموں سے وہ بھی
لگتا ہے کہ چور بہت ہے
ماں بالکل تو رب جیسی ہے
یا شاید رب تیرے جیسا

Abu Bakar Abbad
Associate Professor
Dept. of Urdu University of Delhi
Delhi-110007

غزلیں

عنبرین فاطمہ

نہیں ہے سہل میری جان یہ اشعار لکھ دینا
کسی کے ہجر میں دہکے ہوئے انگار لکھ دینا

میری آنکھوں میں ڈوبی حسرت و آزار کو دیکھو
فضائل درد کے پڑھ کر کوئی شہکار لکھ دینا

میری ہستی کے رازوں کو نہاں رہنے دو اے واعظ
جو آنکھوں سے چھلک جائے اسے اظہار لکھ دینا

نئے موسم میں ہے درکار مالا ایک پھولوں کی
ہمارے دشمنِ جاں کو گلے کا ہار لکھ دینا

تو اپنے لب سے لکھ دے جب دعائیں میرے ماتھے پہ
شفائے روح کے ہر تار پہ جھنکار لکھ دینا

کہ دل کی خیر ہو یا رب رہائی اب تو مشکل
میری زنجیرِ الفت پہ خیالِ یار لکھ دینا

مقتل میں جان و دل کو بھی تنہا نہ کر سکے
ہاں قتل ہو گئے مگر چرچا نہ کر سکے

کرنا تھا سر تسلیم خم اور التجائے یار
لیکن بنامِ شوق ہم اتنا نہ کر سکے

بکھرے تھے کس یقین سے ذرے وجود کے
اپنی شکستہ ذات کو یکجا نہ کر سکے

تھے ہم قفس میں قید یا قفس ہم میں قید تھا
مبہم سا اک خیال بھی افشا نہ کر سکے

اشک رواں سے نم رہی اس دل کی سر زمیں
اک دشت آرزو کو بھی صحرا نہ کر سکے

Ambreen Fatima
Uttar Bihar Gramin Bank Campus
Bagmali, Sanchipatti
Hajipur- 844101 (Bihar)

لذیذ پکوان

اچاری پنیر

اجزا: کوٹیج چیز تین سو گرام، تیل دو کھانے کے چمچ، رائی دانہ ایک چائے کا چمچ، سونف ایک کھانے کا چمچ، میتھی دانہ ایک چٹکی، کلونجی آدھا چائے کا چمچ، زیرہ ایک چائے کا چمچ، ہری مرچ تین سے چار عدد، پیاز دو عدد (باریک کٹی ہوئی)، ہلدی ایک چائے کا چمچ، ادرک ایک انچ کا ٹکڑا (باریک کٹی ہوئی)، لہسن کے جوئے چار سے پانچ عدد (باریک کٹے ہوئے) دہی آدھا کپ، نمک ایک چائے کا چمچ، کھٹائی آدھا چائے کا چمچ

ترکیب: ایک پین میں تیل گرم کر کے سونف، رائی دانہ، میتھی دانہ، کلونجی اور زیرہ ڈال کر کڑکڑا لیں۔ اب ہری مرچ اور پیاز ڈال کر گولڈن براؤن کر لیں۔ پھر ہلدی، ادرک اور لہسن ڈال کر پکائیں۔ ساتھ ہی دہی ڈال کر مکس کر لیں۔ آخر میں نمک اور کھٹائی دیں۔ اب کوٹیج چیز کے کیوبز ڈال کر سرو کریں۔

بیکڈ میوہ بریڈ

اجزا: تیل حسب ضرورت، ڈبل روٹی کے سلائس چھ عدد، دودھ دو کپ، چینی ایک کپ، انڈے چار عدد، الائچی آدھا چائے کا چمچ (پسی ہوئی)، چم چم مکس ایک پاؤ، کھویا ایک پاؤ، کھجور کشمش اور بادام ایک کپ

ترکیب: تیل کو گرم کر لیں۔ اب ڈبل روٹی کے سلائس کے چار ٹکڑے کر کے تیل میں گولڈن براؤن کریں اور نکال لیں۔ اب برتن میں دودھ اور چینی ڈال کر پکائیں۔ پھر انڈوں میں الائچی شامل کر کے بیٹر سے پھینٹ لیں۔ چلتے ہوئے بیٹر کے ساتھ گرم دودھ اس میں ڈال کر مکس کر لیں۔ اس کے بعد اوون پروف ڈش میں ڈبل روٹی کے ٹکڑے رکھیں اور اُن پر انڈے اور دودھ والا مکسچر ڈال دیں۔ اب اس پر چم چم مکس رکھیں۔ اس پر کھویا ڈال دیں۔ پھر اس پر کھجور، کشمش، بادام ڈالیں۔ اور اسے پہلے سے گرم کیے ہوئے اوون میں آدھے گھنٹے کے لیے بیک کر لیں۔

پنجابی یخنی پلاؤ

اجزا: چاول تین سو گرام (بھیگے ہوئے)، چکن آدھا کلو (لیگ پیس)، پیاز دو عدد، گھی ایک پیالی، سونف ایک کھانے کا چمچ (ثابت)، دھنیا ایک کھانے کا چمچ (ثابت)، سونٹھ ایک درمیانہ ٹکڑا، بڑی الائچی چار سے پانچ عدد، تیز پتے دو عدد، لونگ ایک چائے کا چمچ، دار چینی دو ٹکڑے، ہری مرچ چار سے پانچ عدد (درمیان سے کٹی ہوئی)، نمک حسب ذائقہ، دہی آدھا پاؤ، چکن کی یخنی سوا سے ڈیڑھ گلاس، آلو بخارے ایک سو گرام، ٹماٹر دو عدد (کیوبز کیے ہوئے)، ململ کا کپڑا ایک ٹکڑا

ترکیب: پہلے پیاز کو باریک سلائس کر کے گھی کے ساتھ پکنے کے لیے چھوڑ دیں۔ ململ کے کپڑے میں سونف، دھنیا اور سونٹھ باندھ کر پیاز کے ساتھ شامل کر دیں۔ جیسے جیسے پیاز پکتی جائے اس میں بڑی الائچی، تیز پتے، لونگ اور دار چینی شامل کر دیں۔ جب پیاز تھوڑی گولڈن ہونے لگے تو اس میں چکن بھی شامل کر کے اتنا بھونیں کہ چکن پر اچھا سا رنگ آجائے۔ پھر ہری مرچ، نمک، دہی اور یخنی شامل کر دیں۔ جب یخنی پکنا شروع ہو جائے تو اس میں آلو بخارے، ٹماٹر اور چاول شامل کر دیں۔ جب چاولوں میں کنی بننے کا عمل شروع ہو جائے تو چیک کر لیں کہ یخنی میں ببلز ہیں، ورنہ تھوڑا سا یخنی کا اضافہ اور کر دیں۔ اب اسے مکس کر کے آٹھ سے دس منٹ کا دم دے دیں۔ مزیدار پنجابی یخنی پلاؤ تیار ہے۔

ٹنڈا آلو قتلی

اجزا: آلو آدھا کلو، تیل ایک چوتھائی کپ، انڈے تین عدد (اُبلے ہوئے)، ادرک لہسن کا پیسٹ ایک کھانے کا چمچ، املی کا پیسٹ دو کھانے کے چمچ، دہی آدھا پاؤ، رائی دانہ آدھا چائے کا چمچ، لال مرچ ایک چائے کا چمچ (کُٹی ہوئی)، نمک حسب ذائقہ، کلونجی آدھا چائے کا چمچ، ہلدی ایک چائے کا چمچ، لال مرچ ایک چائے کا چمچ (پسی ہوئی)، ٹماٹر دو عدد (اُبلے ہوئے)، پانی ایک کپ، ہری مرچ تین عدد، ہرا دھنیا ایک چوتھائی گٹھی

ترکیب: پہلے آلوؤں کو گول گول قتلوں کی طرح کاٹ کر ایک طرف رکھ دیں۔ اب کڑاہی میں تیل گرم کر کے انڈے فرائی کر کے ایک طرف رکھ دیں۔ اب اسی تیل میں ادرک لہسن کا پیسٹ شامل کر کے تھوڑا سا پکائیں۔ پھر اس میں املی کا پیسٹ اور دہی شامل کر دیں۔ چند سیکنڈ مزید پکانے کے بعد رائی دانہ، کُٹی لال مرچ، نمک، کلونجی، ہلدی، پسی لال مرچ اور ٹماٹر شامل کر کے ایک سے ڈیڑھ منٹ تک پکانے کے بعد کٹے ہوئے آلو شامل کریں۔ پھر ایک سے دو منٹ مزید پکائیں اور ایک کپ پانی شامل کر کے ڈھک کر دَم پر پکنے دیں۔ آٹھ سے دس منٹ بعد جب آلو گل جائیں تو اس میں ہری مرچ اور ہرا دھنیہ شامل کریں۔ پھر آنچ تیز کر کے بھونیں اور فرائی انڈوں کو ایک کے چار کاٹ لیں۔ ڈش میں قتلیاں نکالیں اور انڈوں کو اوپر رکھ کر سرو کریں۔

لیمن آملیٹ سوفلے

اجزا: انڈوں کی زردی چھ عدد، انڈوں کی سفیدی آٹھ عدد، چار لیموں کے چھلکے، شکر ایک پاؤ، مکھن تھوڑا سا

ترکیب: سب سے پہلے انڈوں کی زردی اور شکر ملا کر خوب پھینٹ لیں تاکہ آمیزہ گاڑھا ہو جائے۔ پھر انڈوں کی سفیدی بھی پھینٹ کر برف کی طرح کر لیں۔ سفیدی اور زردی کو آپس میں ملا دیں۔ لیموں کے چھلکے بھی ملا دیں۔ اوون پروف ڈش کی تہہ میں چکنا کاغذ لگائیں۔ اس پر آمیزہ انڈیل دیں۔ گرم اوون میں ڈش چھ منٹ کے لیے رکھ دیں۔ آملیٹ کو آنچ سے ہٹا کے ٹھنڈا کر لیں۔ برتن میں نکال کر دائروں کی شکل میں کاٹ کر اوپر مکھن لگا کر پیش کریں۔

(بحوالہ: www.khanapakana.com)

شکیل احمد

امراض اور پرہیزی غذائیں

اچھی اور مناسب غذا بیماریوں سے حفاظت اور تندرستی کی ضمانت ہے۔ اکثر بیماریاں ناقص تغذیہ کا نتیجہ ہیں، جن کا علاج صحیح غذاؤں کے استعمال سے ہوسکتا ہے۔ جسم میں امراض عموماً کسی عضو کے صحیح کام نہ کرنے کی صورت میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس عضو کے صحیح کام نہ کرنے کی وجہ، کوئی ناگہانی حادثہ، حفظانِ صحت کی کوئی بے اصولی یا غذا میں کسی طرح کا نقص ہو سکتی ہے۔ بیماریوں کے دوران اطبا، غذا اور خوراک کا استعمال عام حالات سے مختلف تجویز کرتے ہیں ان کو پرہیزی غذائیں کہتے ہیں۔ بعض غذائیں مرض میں اضافہ کر دیتی ہیں اور مضر ہیں بعض غذائیں مرض میں کمی کرتی ہیں اور مفید ہیں۔ مختلف بیماریوں کے دوران مختلف پرہیزی غذائیں استعمال کی جاتی ہیں۔ غذائیں اور ان کی تعداد کا انتخاب مریض کے حبث، عمر جنس اور پیشہ کے مطابق اطبا کرتے ہیں۔

پرہیزی غذاؤں کو کھانے میں مریض کو سہولت ہوتی ہے۔ یہ زود ہضم اور مقوی ہوتی ہیں اور ان میں ایسے اجزا موجود ہوتے ہیں جو مرض کے افاقہ میں مدد دیتے ہیں ایک غذا جو کسی مرض میں مفید ہے دوسرے مرض میں مضر ہوسکتی ہے۔ اس لیے پرہیز سے متعلق اطبا کا مشورہ بہت سنجیدگی سے ماننا چاہیے۔ وٹامن کی دریافت کے بہت قبل سے ہی اطبا بیماریوں کے دوران خوراک میں پھل اور ترکاریاں تجویز کرتے تھے۔ اس کی وجہ دراصل وٹامن اور معدنی عناصر کی موجودگی تھی۔ غذائیت کے مشہور ماہر امریکہ کے پروفیسر شرمن کا قول ہے کہ جن لوگوں کی غذا میں پھل، ترکاریاں اور دودھ کی زیادتی ہوتی ہے وہ بڑھاپے میں ضعف پیری اور انحطاط کا شکار نہیں ہوتے۔ ذیل میں چند اہم اور عام امراض کے دوران غذا کے استعمال کے بارے میں مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

ذیابطیس (Diabetes): اس مرض میں پیشاب زیادہ ہوتا ہے اور پیشاب میں شکر آنے لگتی ہے۔ اس کی وجہ کاربوہائیڈریٹ کا ناقص استحالہ ہے جس سے خون میں شکر کی مقدار ضرورت سے زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اس میں تمام درونِ افرازی نظام اور خصوصاً بانقراس میں خرابی پیدا ہوجاتی ہے۔ بانقراس سے دو عصیر، رطوبت لبلبہ اور انسولین خارج ہو کر کاربوہائیڈریٹ کے استحالہ میں مدد دیتے ہیں۔ خرابی پیدا ہونے کی وجہ سے جسم میں کاربوہائیڈریٹ کا استحالہ صحیح نہیں ہو پاتا جس سے کاربوہائیڈریٹ مکمل طور پر توانائی کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ خون میں شامل ہو جاتا ہے جس سے ہائی پرگلائی سیمیا (Hyperglycemia) پیدا ہو جاتا ہے اور شکر پیشاب میں آنے لگتی ہے۔ اس کیفیت کو گلائی کوسوریا (Glycosuria) کہتے ہیں۔

ذیابطیس کی اصل وجہ ابھی معلوم نہیں ہوسکی ہے۔ لیکن تجربہ سے یہ معلوم ہوا کہ یہ مرض موروثی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں یہ مرض وہاں کی مشینوں کی وجہ سے جسمانی محنت کا ترک کر دینا ہے۔ جسم کے موٹاپے اور

وزنی ہونے سے بھی یہ مرض پیدا ہوسکتا ہے۔ عموماً پچاس سال کی عمر کے بعد یہ مرض ہوتا ہے لیکن اوائل عمری میں بھی یہ مرض پایا گیا ہے۔ اوائل عمری میں ذیابطیس زیادہ عمر کے مقابلہ زیادہ خطرناک ہے۔ ڈاکٹر فون اور پیشاب کی جانچ کر کے اس میں شکر کی مقدار معلوم کرتے ہیں اگر وہ تناسب سے زیادہ ہے تو ذیابطیس کا علاج کرتے ہیں۔

ذیابطیس کا علاج پرہیزی غذاؤں کے استعمال سے جس سے گلوکوز کم بنے کرتے ہیں۔ شدید حالت میں انسولین سے علاج کیا جاتا ہے۔ شکر کی جگہ سیکرین کا استعمال مناسب نہیں کیونکہ سیکرین کے دوسرے نقصانات ہیں۔ اس مرض میں کم سے کم کاربوہائیڈریٹ (اسٹارچ اور شکر) والی غذائیں استعمال کرنا چاہیے۔ کھانا بہت سادہ ہونا چاہیے جس میں خصوصیت سے کچی اور ہری سبزیاں اور تازہ پھل جن میں شکر کم ہونا چاہیے۔ چھنے آٹے اور میدہ کے بجائے بغیر چھنے آٹے کی روٹی اور ثابت اناج استعمال کرنا چاہیے۔ ثابت اناج کی مقدار دوگنی کر دینے کے باوجود کاربوہائیڈریٹ کی مقدار وہی رہتی ہے۔ ثابت اناج کے تحول میں آسانی ہوتی ہے۔ ہری ترکاریوں اور تازہ پھلوں سے حاصل کاربوہائیڈریٹ کا تحول اناج (خصوصاً میدہ اور شکر) کے مقابلہ آسان اور استعمال بہتر ہوتا ہے۔ ذیابطیس کچھ حالتوں میں پروٹین کے کم استعمال سے بھی ٹھیک ہوتی ہے۔

پیٹ کے امراض میں پرہیزی غذائیں: چونکہ غذا اور اس کے ہاضمہ کا تعلق پیٹ اور غذا کی نلی سے بہت زیادہ ہے اس لیے پیٹ کے امراض میں غذا کا خاص خیال رکھنا چاہیے۔ غذا کے ہاضمہ پر نفسیاتی اثر بھی پڑتا ہے۔ غصہ میں عجلت۔ تیز گرم حالت میں کھانا کھانے سے غذا کی نلی متاثر ہوتی ہے، جس سے بدہضمی اور دوسرے امراض پیدا ہوتے ہیں لوگ عام طور پر پیٹ کے مریض ہوتے ہیں، جس کا اثر دوسرے اعضا پر بھی پڑتا ہے۔ پیٹ کے خاص امراض یہ ہیں۔

ناسورِ معدہ (Peptic Ulcer): اس میں معدہ یا آنتوں میں ناسور اور زخم ہو جاتے ہیں، جو تکلیف دہ ہوتا ہے اور ہلاکت کا سبب بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں کبھی کبھی معدہ یا آنتوں میں چھوٹے چھوٹے سوراخ پھوٹتے ہیں اور سیلانِ خون ہوتا ہے۔ اسی پیٹ کے ناسور سے کبھی سرطان پیدا ہو جاتا ہے، جو انتہائی مہلک ہے۔ ناسور معدہ میں تیزاب بنانے والی غذائیں اور گوشت وغیرہ سے پرہیز کرنا چاہیے۔ قہوہ چائے، سگریٹ، مرچ اور تیل بھی مضر ہیں۔ پروٹین اور چکنائی کی غذائیں خصوصاً دودھ بہت مفید ہیں۔ اسی طرح انڈا، کریم زیتون کے تیل کا ناسور معدہ میں، استعمال مفید ہے۔ غذا کو اکٹھا پیٹ بھر کھانے سے، تھوڑے تھوڑے وقفہ سے کئی بار میں کھانا بہتر ہے۔

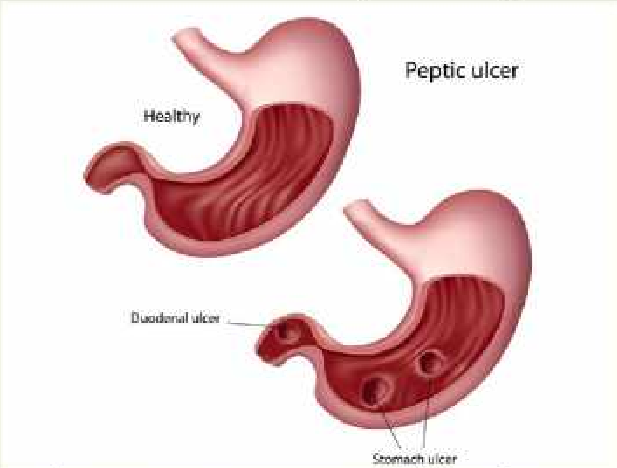

بدہضمی (Indigestion): غذا کی خرابی سے بدہضمی کی شکایت عام طور پر ہو جاتی ہے۔ اس سے تخمہ، ہیضہ، قے، دست وغیرہ ہونے لگتے ہیں۔ پیٹ میں درد ہوتا ہے۔ بدہضمی زیادہ کھانا کھا لینے سے بھی ہو جاتی ہے۔ پیٹ کی خرابی سے دوسرے امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ بدہضمی میں وقتی طور پر کھانا بند کر دینا چاہیے اور ڈاکٹر کو دکھلا کر دوا لینا چاہیے۔ بعد میں بہت ہلکی اور زود ہضم غذا آہستہ آہستہ شروع کرنا چاہیے۔ تلی ہوئی چیزیں، مٹھائی، مربے، مرچ وغیرہ سے پرہیز کرنا چاہیے۔

تخمہ یا اسہال (Diarrhoea): اس میں غذا، قناتِ ہاضمہ سے بہت جلد بغیر ہضم اور تحلیل ہوئے اجابت کی شکل میں باہر نکل جاتی ہے۔ اجابت میں پانی کی مقدار بڑھ جاتی ہے اور اس میں غیر متحول غذا موجود رہتی ہے۔ اجابت پتلی اور بار بار ہوتی ہے۔ اسہال اکثر مکروب طبی بیکٹیریا کے ذریعہ غذائیں سمیت پیدا ہونے سے ہوتا ہے۔ عام حالتوں میں یہ دو یا تین دن میں ٹھیک ہو جاتا ہے اسہال میں ابتدا میں نہ کھانا چاہیے۔ بعد میں آہستہ آہستہ چائے بسکٹ، شوربہ اور دوسری ہلکی غذائیں لینی چاہیے۔ اگر

پیچش کی شکل ہو تو کم فضلہ والی غذا جس میں غذائیت زیادہ ہو دینی چاہیے۔ ثابت اناج، روٹی، کچی سبزیاں اور پھلوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ پھلوں میں صرف کیلا مفید ہے۔ پھلوں کے عرق دیے جا سکتے ہیں۔ بچوں کو زیادہ دست آجانے سے بدن میں پانی کی کمی ہو جاتی ہے جو مہلک ہے۔ اس لیے ان کو عرق اور پانی برابر دیتے رہنا چاہیے۔

قبض(Constipation): روزانہ اجابت کا ہونا صحت کے لیے ضروری ہے۔ اگر اس میں بے نظمی ہوتی ہے تو الجھن اور دوسری پریشانیاں ہو جاتی ہیں۔ اس کے لیے غذا موٹی بھوسی دار اور ڈنٹھلوں والی ہونا چاہیے۔ ثابت اناج، بغیر چھنے آٹے کی روٹی، ڈنٹھل والی سبزیاں اور ریشے دار پھل قبض کو ختم کرنے میں کارآمد ہیں۔

عمل جراحی کے دوران پرہیزی غذائیں: عمل جراحی کے دوران غذائیں عام حالتوں (صحت اور بیماری) سے مختلف ہوتی ہیں۔ عمل جراحی سے قبل اور بعد کی غذاؤں میں بھی فرق ہوتا ہے۔ یہ غذائیں مریض کی حالت کے موافق تجویز کی جاتی ہیں۔ ناگہانی حالت میں آپریشن میں اس کا لحاظ رکھنا مشکل ہے لیکن عام حالت میں اس کا خیال رکھا جاتا ہے۔ آپریشن سے قبل مریض کی حالت دیکھ کر معلوم کرتے ہیں کہ اس کے اندر غذا کے کسی جز کی کمی تو نہیں ہے۔ اگر مریض کمزور ہے تو اس کو طاقت کی غذائیں دی جاتی ہیں۔ کچھ آپریشن معمولی ہوتے ہیں اور بعض اہم ہوتے ہیں۔ ان تمام باتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے سرجن آپریشن کرتا ہے۔ اگر مریض کا وزن کم ہے، وہ کمزور ہے تو آپریشن سے پہلے اس کو زیادہ غذائیت کی خوراک جیسے دودھ، انڈا، پھلوں کے عرق، زیادہ پروٹین کی مشروبات دی جاتی ہیں تاکہ غذا جلد ہضم ہو کر مریض کو توانائی دے۔ اگر جسم میں سیال کی کمی کسی وجہ سے ہے تو اس کے لیے سیال غذائیں منہ یا انجکشن کے ذریعہ پہنچاتے ہیں۔ پانی کی کمی سے نمک کی بھی کمی ہو جاتی ہے اس لیے گلوکوز کے ساتھ نمک ملا کر نسوں کے ذریعہ جسم میں پہنچاتے ہیں۔ اگر مریض میں گلائیکوجن کم ہو گیا ہے تو زیادہ کاربوہائیڈریٹ والی غذائیں دیتے ہیں، مثلاً پھلوں کے عرق میں لیکلوز ملا کر دیتے ہیں اور گلوکوز نسوں کے ذریعہ جسم میں پہنچاتے ہیں۔ اگر جسم میں پروٹین یا سیرم پروٹین کی کمی ہے تو زیادہ پروٹین اور زیادہ کاربوہائیڈریٹ کی غذائیں دیتے ہیں تاکہ کاربوہائیڈریٹ، توانائی کے لیے استعمال ہو اور پروٹین جسم کے اعضا میں استعمال ہو۔ سیرم پروٹین کی کمی کو پورا کرنے کے لیے باہر سے جسم میں خون پہنچاتے ہیں۔

اسی طرح دیگر علتوں اور کمیوں مثلاً جسم میں پانی کی زیادتی، خون کی کمی، وٹامن کی یوریا کا خون میں جمع ہونا، کیتونیت کا ہونا وغیرہ کا غذ کی مدد سے درست کر کے آپریشن کرتے ہیں۔ اگر آپریشن سے قبل ان باتوں کا لحاظ نہ رکھا جائے تو پیچیدگی پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر مریض توانا ہے تب بھی آپریشن کو برداشت کرنے اور بعد میں چند یوم بغیر غذا کے رہنے کی صلاحیت پیدا کرنے کی خاطر اس کو مناسب اجزا اور توانائی کی غذائیں آپریشن سے قبل دیتے ہیں۔ آپریشن سے پہلے جسم میں پروٹین اور کاربوہائیڈریٹ کافی جمع ہو جانا چاہیے۔ جس دن آپریشن ہوتا ہے اس سے قبل والی رات سے ہی مریض کا کھانا اور پانی بند کر دیتے ہیں اور آپریشن کے بعد دو یا تین دن تک کوئی غذا منھ سے نہیں دی جاتی صرف انجکشن کے ذریعہ پہنچاتے ہیں۔ یہ تمام باتیں اس پر منحصر ہیں کہ کس جگہ اور کس قسم کا آپریشن ہے۔ پیٹ اور آنتوں کے آپریشن سے قبل دست آور دوا دے کر پیٹ صاف کر دیتے ہیں اور آپریشن کے بعد تین یوم تک منھ کے ذریعہ کوئی غذا نہیں دیتے تاکہ معدہ اور آنتوں پر بالکل زور نہ پڑے۔ صرف انجکشن کے ذریعہ نسوں میں گلوکوز چڑھاتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ ہلکی غذا مثلاً پھلوں کا رس وغیرہ دینا شروع کرتے ہیں۔ اس کے بعد دودھ، پھر سیال اور زود ہضم غذائیں۔ رفتہ رفتہ غذاؤں کی مقدار بڑھاتے ہیں لیکن ان تمام حالتوں میں غذائیت پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

آپریشن کرتے وقت عموماً مریض کو بے ہوش کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے ہوش آنے کے بعد جب بے ہوش کرنے والی چیز کا اثر زائل ہو جاتا ہے کوئی غذا دی جاتی ہے۔ پیٹ (معدہ آنت وغیرہ) کے آپریشن کے علاوہ دوسرے تمام آپریشنوں میں بے ہوشی کا اثر ختم ہونے پر سب سے پہلے پانی یا برف کا ٹکڑا منھ میں ڈالتے ہیں۔ اگر اس سے قے نہ ہو تو دوسری مشروبات چائے، شربت، ادرک کا پانی، شوربہ وغیرہ بتدریج دیتے ہیں۔ سیال غذائیں مقوی اور زود ہضم ہوتی ہیں۔ جب مریض کچھ توانا ہو جاتا

ہے، پھر آہستہ آہستہ پوری خوراک دیتے ہیں۔

قلبی امراض میں غذائیں: یہ مرض آج کل عام ہے۔ اخبارات میں دل کی خرابی سے موت کی خبریں ہم پڑھتے ہیں۔ فعل قلب کی بے نقلی کے کئی وجوہ ہو سکتے ہیں، جن میں ایک وجہ خوراک میں مخصوص غذائیت کی کمی بھی ہے۔ دل کی بیماریوں کی تشخیص ہم اکثر نہیں کر پاتے اور مریض سالوں بغیر صحیح علاج اس میں مبتلا رہتا ہے اور مضر غذائیں بھی کھاتا رہتا ہے۔ بعض حالتوں جیسے گٹھیا کا بخار وغیرہ میں علاج ممکن اور آسان ہے۔ فربہی (موٹاپے) سے بھی دل کے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ تمباکو اور شراب کا استعمال دل کے لیے مضر ہے۔ اسی طرح مرغن غذائیں دل کے مریض کے لیے نقصان دہ ہیں۔ دل کی بیماری میں ان غذاؤں کو دیتے ہیں جن میں نمک بہت کم ہو۔

اوسط آدمی کو دل کی بیماری میں عام حالت کے مقابلہ کچھ کم کیلاری کی غذائیں، جن میں نمک یا تو نہ ہو یا بہت کم ہو دینا چاہیے۔ ایسے مریض کے لیے روزانہ کی غذائیت کا اوسط پروٹین 40 گرام توانائی 900 کلو کیلاری اور سوڈیم ایک گرام سے کم ہونا چاہیے۔ خوراک تجویز کرتے وقت مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا چاہیے۔ خوراک غذائیت کے تمام اجزا میں مشتمل ہو۔ ثقیل اور بادی چیزوں سے پرہیز کرنا چاہیے تاکہ پیٹ بھاری نہ ہو اور نہ پھولے جس سے دل پر کوئی دباؤ نہ پڑے۔ گوبھی، کرم کلہ، گانٹھ گوبھی نہیں کھانا چاہیے۔ خشک مٹر، سیم اور دوسری پھلیوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ یہ چیزیں بادی ہونے کی وجہ سے جلد خمیر بن کر پھول جاتی ہیں، جس سے پیٹ میں ریاح بنتے ہیں، جن کا دباؤ قلب پر پڑتا ہے۔ ایسی کوئی غذا نہیں دینا چاہیے جس کو ہضم کرنے میں مریض کو دقت ہو۔ ریشہ دار غذائیں استعمال کریں تاکہ قبض اور دوسری پیٹ کی بیماریاں نہ ہوں۔ نشہ آور اشیا سے پرہیز کرنا چاہیے چائے اور قہوہ کا استعمال کم کرنا چاہیے۔ زیادہ خراب حالت میں مریض کو کھانے میں دقت ہوتی ہے اس لیے سیال غذائیں جیسے پھلوں کا عرق، دودھ وغیرہ دینا چاہیے۔ اکٹھا پیٹ بھر کھانے سے دن میں کئی بار کر کے کھانا بہتر ہے۔ ایک پاؤ دودھ صبح، ایک پاؤ دوپہر، ایک پاؤ شام اور ایک پاؤ رات میں پینا چاہیے۔ حالت سدھرنے پر اناج کا پتلا دلیا، ڈبل روٹی، نرم پکا انڈا، ابلے ہوئے آلو کا بھرتا، سبزی اور پھلوں کا شوربہ ہڈی کا گودہ کسٹرڈ اور آئس کریم جیسی نرم اور بغیر نمک کی غذائیں دھیرے دھیرے دینا چاہیے۔ کھانا پکانے میں یا الگ سے نمک کا استعمال بالکل نہیں کرنا چاہیے۔ بہتر ہے کہ تمام خوراک کو دن میں پانچ یا چھ بار میں کھائیں تاکہ کھانے میں کسی طرح کی تکان نہ ہو۔

گردے کے امراض میں غذائیں: گردوں کا کام جسم کے سیال کی صفائی کرنا ہے۔ اس کی وجہ سے ہی خون کی صفائی ہوتی ہے۔ بیکار اجزا پیشاب کے ذریعہ جسم سے خارج ہو جاتے ہیں۔ گردے میں کئی طرح کی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً جراثیم کا پیدا ہو جانا، گردہ کا سڑ جانا، گردہ میں پتھری پڑ جانا وغیرہ۔ اس سے گردے صحیح طور سے کام کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ گردہ بہت نازک عضو ہے۔ اس کی خرابی سے متعدد تکلیف دہ امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ گردوں کے علاج کے دوران ایسی غذائیں دی جانی چاہیے جس سے گردوں پر کم سے کم زور پڑے اور ان کو آرام کا موقع ملے۔ گردے کے عام امراض یہ ہیں۔

(1) ورم گردہ (Nephritis): اس سے کئی متعددی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ ورم گردہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ (الف) Glomerulonephritis یہ عموماً چھوٹی عمر والوں اور بچوں کو ہوتا ہے۔ (ب) Nephrosclerosis یہ ادھیڑ اور زیادہ عمر والوں کو ہوتا ہے اس میں کم نمک کی غذائیں دی جانی چاہیے۔

(2) یوریئیت خون (Urria): اس میں یوریا کی نائٹروجن خون میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس میں کم پروٹین اور کم نمک کی غذا کا استعمال کرنا چاہیے۔

(3) (Kidney Failure): ورم گردہ کی آخری شکل گردوں کا کام بند کر دینا ہے۔ اس میں خون گردوں میں نہیں پہنچتا۔ پیشاب بہت کم بنتا ہے اور تمام فاسد اجزا خون میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس کے لیے مصنوعی گردہ لگانے کی ضرورت پڑتی ہے تاکہ وہ خون کی صفائی کر سکے۔ اس میں پروٹین بالکل نہیں لینی چاہیے۔ سوڈیم کلورائڈ اور پوٹاسیم

بھی خوراک میں بالکل نہیں ہونا چاہیے۔

(4) انحطاط گردہ (Nephrosis): اس میں گردہ سے سیرم البیو میں بالکل ختم ہو جاتا ہے جس سے استسقا لحمی (Oeddia) ہو جاتا ہے۔ یہ بیماری خاص کر بچوں میں ہوتی ہے۔ اس میں زیادہ پروٹین، کم نمک اور کم سیالی غذائیں دینا چاہیے۔ چونکہ پروٹین کو ہضم کر پانا مشکل ہو جاتا ہے اس لیے زیادہ پروٹین اور کم سوڈیم کے مشروبات بہت مناسب ہیں۔

(5) گردے میں پتھری (Kidney Stones): گردے میں کبھی کبھی پتھری پڑ جاتی ہے۔ یہ سائز میں ایک چھوٹے ذرے سے لے کر بڑی پتھری جو پیڑو کو بھر لے ہو سکتی ہے۔ پتھری مثانہ میں بھی ہوتی ہے۔ پتھری پڑنے کی وجہ، برحلمی خلیوں کو کوئی نقصان یا پیشاب کے اجزا کی کوئی کیمیاوی تبدیلی ہوتی ہے۔ عام حالات میں پیشاب ہلکا تیزابی ہوتا ہے۔ اگر کسی وجہ (خوراک میں کھار) سے وہ کھاری ہو جاتا ہے تو یا کبھی کسی تغذیہ کی وجہ سے گردہ میں پتھری بن جاتی ہے۔ یہ پتھری کیلیم کے نمک مثلاً آکسلیٹ، فاسفیٹ، کاربونیٹ وغیرہ کے جم جانے سے بن جاتی ہے۔ کبھی کبھی پیشاب کے تیزابی ہونے کے باوجود یورک ایسڈ اور سٹائن کی وجہ سے بھی پتھری بن جاتی ہے۔ پتھری میں غذا کی تجویز پتھری کی قسم معلوم کر کے کرنا چاہیے۔ اگر کیلیم فاسفیٹ کی وجہ سے پتھری ہے تو المونیم ہائیڈ اکسائڈ سے علاج ہو سکتا ہے المونیم ہائیڈ اکسائڈ سے المونیم فاسٹیٹ بنتا ہے جو اجابت کے ساتھ نکل جاتا ہے۔ اور کیلیم، کلورائڈ یا سٹریٹ کی شکل میں پیشاب کے ذریعہ خارج ہو جاتا ہے۔ اس بیماری میں کم کیلیم اور کم فاسفورس کی غذائیں کھانا چاہیے۔ اس کے لیے دودھ (صرف ایک پیالی)، انڈا (دن میں صرف ایک) گوشت (صرف بھیڑ، بچھڑا اور مرغ کا چار آونس) شوربہ، یخنی، سبزیاں، پھل، لیمو اور نارنگی، سنترہ وغیرہ کا روزانہ استعمال کرنا چاہیے۔ اناج میں میدہ اور چھنے آٹے کے پکوان، کارن فلیک، پکا ہوا چاول، شکر جیلی۔ شہد، نمک، کالی مرچ، گرم مسالہ وغیرہ، قہوہ، چائے، ادرک کا پانی، سونٹھ وغیرہ کا استعمال کر سکتے ہیں۔

وہ غذائیں جن میں کیلیم اور فاسفورس زیادہ ہیں مندرجہ ذیل ہیں:

گوشت: بھیجہ، دل، کلیجی، گردہ، لبلبہ، شکار کیے ہوئے جانور جیسے چکور، خرگوش، ہرن، تیتر وغیرہ کا گوشت، سارڈائن اور روہو مچھلی۔

سبزیاں: چقندر، سرسوں کا ساگ، پالک، شلجم، خشک پھلیاں، مٹر مسور، سویابین۔

پھل: ریوند چینی

اناج۔ بغیر چھنے آٹے کی روٹی، ثابت اناج، رائی، جئی کا آٹا یا دلیا۔ بجیا، یا جنگلی چاول، بھوسی، گیہوں کا اکھوا، جوز کری دار میوے۔ مونگ پھلی کا تیل، چاکلیٹ، کوکوا وغیرہ۔

گردے میں دوسرے قسم کی پتھری یورک ایسڈ کے جمع ہو جانے سے بنتی ہے۔ یورک ایسڈ پیورین سے بنتا ہے۔ پیورین کے استحالہ میں خرابی سے گردہ میں پتھری بن جاتی ہے اور نقرس (گٹھیا) کا مرض بھی اس سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے لیے کم یورین کی غذائیں کھانا چاہیے جو مندرجہ ذیل ہیں۔ 1۔ دودھ (دو یا تین پیالے روزانہ)۔ 2۔ پنیر (حسب خواہش)۔ 3۔ انڈا (ایک روزانہ)۔ 4۔ چکنائی (مکھن یا جیسے تجویز ہو)، 5۔ سبزیاں (حسب ضرورت، خصوصاً خشک پھلیاں، مٹر، مسور، پھول گوبھی، کبھی کبھی پالک، آلو کے ساتھ ایک یا دو قسم کی ہری یا زرد ترکاریاں) 6۔ پھل (حسب خواہش، لیمو اور نارنگی کا استعمال روزانہ)۔ 7۔ اناج (باریک آٹا، میدہ کبھی کبھی بغیر چھنے آٹے کی روٹی۔ 8۔ مشروبات (قہوہ، چائے، کوکوا)، 9۔ جوز مسالے وغیرہ۔

تیزابی اور کھاری راکھ والی غذائیں: غذا کے تکسیدی عمل میں معدنی عناصر باقی رہ جاتے ہیں۔ ان کو غذا کی راکھ کہتے ہیں۔ کچھ عناصر جیسے کیلیم اور لوہا اجابت کے ساتھ نکل جاتے ہیں اور کچھ پیشاب کے ساتھ خارج ہو جاتے ہیں۔ غذا کو تبدیل کر کے پیشاب کو تیزابی یا کھاری بنایا جا سکتا ہے۔ پیشاب اگر تیزابی ہے تو وہ کھاری پتھری کو گھلا کر زائل کر سکتا ہے اگر کھاری ہے تو تیزابی پتھری اس میں گھل جاتی ہے۔ اس طرح بھی پتھری کا علاج کیا جاتا ہے۔ بیشتر سبزیاں اور پھل کھاری راکھ بناتے ہیں جس سے پیشاب کھاری ہوتا ہے۔ گوشت مچھلیاں، پرند، انڈے اور اناج تیزابی راکھ دیتے ہیں، جو پیشاب کو تیزابی بناتا ہے۔ کھاری راکھ دینے والی غذائیں جیسے سبزیاں اور پھول یورک ایسڈ اور سٹائن کی پتھری میں مفید ہیں، جبکہ گوشت، انڈے اور اناج مضر ہیں۔ برخلاف اس کے کیلیم فاسفیٹ اور کیلیم کاربونیٹ کی پتھری میں گوشت، انڈے اور اناج مفید اور سبزیاں اور پھل مضر ہیں۔ دودھ میں اگرچہ کھاری عنصر کیلیم ہوتا ہے اس کے باوجود اس کی تھوڑی مقدار دونوں غذاؤں میں ضروری ہے۔ ہر حالت میں غذائیت کا پورا خیال رکھنا چاہیے دونوں طرح کی پتھریوں میں زیادہ سے زیادہ سیال غذائیں دینا مفید ہیں اس سے پیشاب پتلا رہتا ہے ان سے گردہ میں تلچھٹ جمنے نہیں پاتی۔

(ماخوذ: ہماری غذا، شکیل احمد، تیسری طباعت 2010، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)

□□□

حسن کی نگہداشت

سرسوں میں چھپے آپ کی صحت سے متعلق ایسے راز جو شاید آپ کو پہلے معلوم نہ ہوں

سب سے دیکھا بھی ہے سنا بھی ہے اور استعمال بھی کیا ہے کیونکہ صدیوں سے صرف سرسوں کا تیل استعمال کیا جا رہا ہے بڑے ہوں یا بچے بالوں میں لگانا ہو یا درد کی شکایت میں، کھانا بنانا ہو یا کسی بیماری کے علاج میں غرضیکہ ہر چیز میں سرسوں کا تیل یاد آتا ہے۔

سرسوں کا تیل ہی کارآمد نہیں اس کے بیج یہاں تک کہ پورا سرسوں کا پودا ہمیں مختلف طریقوں سے فائدہ پہنچاتا ہے۔

خصوصیت: سرسوں میں بڑی تعداد میں وٹامن ای، فیٹی ایسڈز، الفالائینولنک ایسڈ، اینٹی بیکٹریل، حیاتین ب، کیلشیم، آئرن، گندھک، اینٹی فنگل، صفر کیلوریز اور بیٹا کیروٹن پایا جاتا ہے جو آپ کی نہ صرف صحت بلکہ خوبصورتی اور نکھار میں کسی مہنگے ٹانک جیسے فوائد دیتا ہے۔

افادیت: سرسوں کی افادیت اتنی ہے کہ شاید اس کے بارے میں سب کچھ بتانا آسان نہیں لیکن آپ کے لیے ہم یہاں بتا رہے ہیں وہ فوائد جو آپ کے لیے بنیادی طور پر جاننا بہت ضروری ہیں:

- بچوں کے پیٹ میں اکثر کیڑے ہو جاتے ہیں جو ان کے اندرونی نظاموں میں بے ربطگی پیدا کرتے ہیں ان سے بچنے کے لیے آپ سرسوں کا استعمال کریں یہ جراثیم کش ہے تمام تر کیڑوں کو باہر نکلنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔
- جسمانی خارش اور کھجلی میں سرسوں کا تیل لگانا مفید ہے۔
- قبض کی شکایت میں آپ سرسوں پکا کر کھائیں یا اس کے بیج گرم پانی سے پھانک لیں یہ دونوں طرح آپ کے لیے مفید ہے۔
- پرانی کھانسی، بلغم، نزلہ اور گلے کی خراش کا سستا حل سرسوں کا استعمال ہے۔
- خواتین کو جسم میں ورم، درد اور سوجن کی شکایت زیادہ ہوتی ہے ایسے میں آپ اگر سرسوں کے تیل کی مالش کریں تو یہ فائدہ مند ہے۔
- کان کا درد، کمر درد ہو یا دانت کا درد سرسوں کا استعمال نہ بھولیں۔
- آنکھوں کی تکلیف میں آپ سرمے میں تھوڑا سا سرسوں ڈالیں اور اس کو آنکھوں میں لگا لیں یہ راحت دیتا ہے۔

دبلے لوگوں کے لیے سرسوں کا استعمال زیادہ مفید ہے یہ بھوک بڑھاتا ہے اور جسم کو ضروری حیاتین کی فراہمی کرتا ہے۔

• چھ سے آٹھ مہینے کے بچوں کو اگر سرسوں کے تیل کا استعمال کروایا جائے تو یہ ان کی نشوونما کے لیے بہت اہم سمجھا جاتا ہے۔ اس سے ان کی مالش کریں تو پٹھے مضبوط ہوتے ہیں۔

• رگیں چڑھنے کی بیماری ہو یا جسم سن ہونے کی سرسوں کی مالش آپ کے لیے مفید ہے۔

• ہاتھ، پاؤں کی خشکی اور ایڑھیاں پھٹ جائیں تو بھی یہ آپ کو فائدہ دیتا ہے۔

• ذہنی دباؤ اور نفسیاتی بیماریوں میں سرسوں کا استعمال بہتر ہے۔

• پیٹ میں گیس زیادہ ہو جائے تو اس کو استعمال کرنا نہ بھولیں۔

• ناخنوں سے پھپھوندی (فنگس) کے امراض دور ہوتے ہیں، پھٹے ہونٹ نرم ہو جاتے ہیں۔

آنکھوں سے پانی آنے اور چھینکوں کی شکایت میں اس کے تیل کی مالش اچھی ہوتی ہے۔

استعمال: اس کو آپ ویسے تو کسی بھی طرح کر سکتے ہیں مگر زیادہ تر:

• سرسوں کے ساگ کو پکا کر کرتے ہیں۔

• اس کا تیل استعمال کیا جاتا ہے۔

• اس کے بیجوں کو سادے پانی کے ساتھ پھانک لیتے ہیں۔

• سرسوں کا مکھن بھی آپ کی ہڈیوں کے لیے بہت مفید ہے۔

جلد کے لیے:

جلد کی خوبصورتی کے نکھار میں سرسوں کے تیل میں شامل وٹامن ای سب سے زیادہ فائدہ مند ہے۔

• چہرے پر آپ سرسوں کے تیل کو ابٹن اور بیسن میں ملا کر لگائیں آپ کی جلد روشن و چمکدار ہو جائے گی۔

• آئلی جلد کے لیے انڈے کی سفیدی میں مکس کر کے لگائیں یہ آئل کنٹرولنگ کا کام کرتا ہے۔

خشک جلد کے لیے انڈے کی زردی میں مکس کر کے لگانا خشکی کو کنٹرول کرتا ہے۔

بالوں کے لیے:

• بالوں کو لمبا، گھنا اور مضبوط بنانے کے لیے صدیوں سے سرسوں کا تیل استعمال کیا جا رہا ہے۔

• انڈے اور دہی میں سرسوں کا تیل مکس کر کے ہفتے میں ایک بار لگائیں اور خود اپنے بالوں کی نشوونما دیکھیں۔

• پیاز کے پانی میں سرسوں کا تیل اچھی طرح مکس کر کے لگائیں اور خشکی، سکری کے مسائل پر قابو پائیں۔

دانتوں کی صفائی میں مددگار قدرتی نسخے

دانت شخصیت کی نمائندگی کرتے ہیں اور اگر یہ پیلے ہوں تو دوسروں پر آپ کی شخصیت کا برا تاثر جاتا ہے اور ان کے پیلے ہونے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ بیماری پیدا کرنے والے جراثیم منہ میں اپنی افزائش کرتے ہیں اور کھانے کے ساتھ پیٹ میں جا کر ہماری صحت خراب کرتے ہیں۔

اگر آپ بھی دانتوں کو پیلا ہونے سے بچانا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہر کھانا کھانے کے بعد انگلی کی مدد سے دانت ضرور صاف کریں، پانچوں نمازوں کے لیے وضو کرتے وقت مسواک ضرور استعمال کریں تو آپ کے دانت کبھی بھی خراب نہیں ہوں گے۔

دانتوں کو مضبوط اور چمکدار بنانے کے قدرتی نسخے:

نسخہ نمبر 1: ہلدی کی جڑ کا سفوف چار چمچ، بیکنگ سوڈا آٹھ چمچ، کوکونٹ آئل تین چمچ

ان تمام اشیا کو ملا کر رکھ لیں اور تھوڑی سی مقدار ٹوتھ پیسٹ کے طور پر استعمال کریں۔

نسخہ نمبر 2: میٹھا سوڈا پانچ چائے کے چمچ، پودینے کا تیل پانچ چائے کے چمچ، ویجیٹیبل گلیسرین دو قطرے، نمک ایک چائے کا چمچ

ترکیب: پانچ چائے کے چمچ میٹھا سوڈا، پانچ چائے کے چمچ پودینے کا تیل دو قطرے ویجیٹیبل گلیسرین اور ایک چائے کا چمچ نمک ان سب کو مکس کر کے ایک بوتل میں محفوظ کر لیں روزانہ اس پیسٹ سے دانت صاف کریں دانتوں کے تمام مسائل سے چھٹکارا مل جائے گا۔

(بحوالہ www.kfoods.com)

تاثرات: نگر نگر سے

اگر یوں کہوں کہ ''خواتین دنیا'' کو اولیت حاصل ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ منفرد اس لیے بھی ہے کہ اس میں شائع ہونے والی تخلیقات خواتین سے متعلق ہوتی ہیں یا پھر خواتین پر ہی لکھی جاتی ہیں۔ اداریہ اس کا خاص حسن ہے۔ یہ علم و آگہی سے بھرپور ہوتا ہے۔ اس سے تعلیمی اداروں سے وابستہ خواتین ہی نہیں گھریلو خواتین بھی بخوبی استفادہ کر سکتی ہیں۔ سلیس اور شائستہ انداز تخاطب اس کی خاص خوبی ہے۔ مضامین معلومات کا خزانہ اور کہانیاں دل کو چھو لیتی ہیں۔ پکوان اور صحت کے متعلق بھی مواد خوبصورتی سے مع تصویروں کے پیش کیا جاتا ہے۔ غرض ہر طرح سے 'خواتین دنیا' دل و دماغ کو نئی تازگی بخشتا ہے۔

میمونہ علی چوگلے، ممبئی، مہاراشٹر

ستمبر 2020 کا شمارہ موصول ہوا۔ شخصیت کے ذیل میں ڈاکٹر عرش کاشمیری کا مضمون دیا گیا ہے جو خدیجہ مستور کے سیاسی و سماجی شعور سے متعلق ہے۔ شاعرات کے منتخب اشعار بھی پسند آئے۔ جہان نسواں کے تحت پانچ مضامین شامل ہیں۔ کہانیوں میں خوشبو کا سفر، مجبوری اور کنگن کو شامل کیا گیا ہے۔ مینا خان کی کہانی 'مجبوری' بہت پسند آئی۔ کہانی بیان کرنے کا انداز بھی دلکش ہے۔ حسن سخن میں شیبا کوثر کی دونوں نظمیں 'امید' اور 'دیا جلاؤ' بہت عمدہ ہیں۔ شبانہ عشرت کی نظموں نے بھی متاثر کیا۔

لذیذ پکوان ہر مہینے کی طرح اس مہینے بھی لاجواب اور ذائقے سے بھرپور ہے۔ صحت کے تحت 'انفلوئنزا' پر مضمون رسالے میں شامل ہے اور اس سے بچاؤ کی تدبیریں بھی بتائی گئی ہیں۔ حسن سے متعلق نسخے بھی لاجواب اور کارگر ہے۔ خواتین خبرنامہ بھی معاشرے میں خواتین کی نمائندگی کو ظاہر کرتا ہے۔ غرض 'خواتین دنیا' ہر لحاظ سے ایک کامیاب رسالہ ہے۔

ریحانہ بانو، سنبھل، یوپی

ستمبر کا شمارہ نظر سے گزرا۔ 'مشعل' کے تحت دیے گئے اداریہ میں ساوتری بائی پھلے اور ثنا شیخ کا ذکر موجود ہے۔ اس زمانے میں جبکہ ہمارا معاشرہ خواتین کی تعلیم کے معاملے میں اتنا بیدار نہیں ہوا تھا۔ اس وقت ساوتری بائی پھلے اور ان کی معاون ثنا شیخ نے خواتین کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا تھا۔ ساوتری بائی نے لڑکیوں کی تعلیم کے لیے بہت کوششیں کیں۔ ناصرہ شرما کا انٹرویو بھی پسند آیا۔ کہانیوں میں تینوں کہانیاں لاجواب ہیں۔ خصوصی طور پر 'خوشبو کا سفر' بے حد پسند آئی۔

ثنا حبیب، گھوسی، مئو، یوپی

'خواتین دنیا' اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ ہے۔ اس میں خواتین سے متعلق بہت سا مواد موجود ہوتا ہے۔ اس میں خواتین سے متعلق انٹرویو، مضامین، کہانیاں اور شاعری موجود ہوتی ہے۔ خوش آئند بات یہ بھی ہے کہ اس کے زیادہ تر مضامین یا تو خواتین کے ذریعے لکھے جاتے ہیں یا پھر مضامین میں خواتین کی شخصیت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خواتین سے متعلق بہت سے کالم خواتین کو ذہن میں رکھ کر ہی مخصوص کیے گئے ہیں۔ باورچی خانہ، لذیذ پکوان، حسن کی نگہداشت اور خواتین خبرنامہ یہ وہ کالمز ہیں جو خواتین کے لیے ہی مخصوص ہیں۔ غرض یہ رسالہ ہر اعتبار سے مکمل اور کامیاب رسالہ ہے۔

گلشن ، بیگم، بھونڈی، بھوپال، ایم پی

ایک لڑکی کو تعلیم یافتہ بنانا ایک نسل کو تعلیم یافتہ بنانا ہے: اریبہ صغیر

والدین اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دیں خاص طور سے لڑکیوں کو،

کیونکہ امپاورمنٹ کا راستہ علیم سے ہو کر گزرتا ہے۔ یہ بات یو پی پی سی ایس کے مقابلہ جاتی امتحانات 2018 میں 57 واں رینک حاصل کرنے والی اریبہ صغیر نے کہی۔ انھوں نے اپنے تعلیمی کیریئر، اہداف، عزائم اوران کے لیے کی جانے والی جدوجہد کو شیئر کرتے ہوئے کہا کہ نئی دہلی کے Father Angel School سے اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد گلگوٹیا کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹکنالوجی گریٹر نوئیڈا سے کمپیوٹر سائنس سے بی ٹیک کیا۔ اس کے بعد میں نے فری لانس ویب ڈیزائنر کی حیثیت سے ملازت تو شروع کر دی لیکن میری منزل اور ہدف کچھ اور تھا، میں مسلسل سول سروسیز کی تیاری کرتی رہی اور پہلی بار یو پی ایس کا ٹسٹ دیا اور کامیاب رہی۔ اریبہ صغیر نے کہا کہ یہ کامیابی بڑی جدوجہد اور محنت و لگن کے بعد ملی ہے۔ زندگی میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں۔ اس میں جو توازن قائم کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے وہی کامیاب ہوتا ہے، میرے حوصلے اور جنون نے ہی مجھے زندگی میں ہارنے نہیں دیا۔ بچپن سے ہی اپنی سوسائٹی، اپنے ملک کے لوگوں اور ان لوگوں کی خدمت کرنے کا جنون تھا، جو دو وقت کی روٹی کا بھی انتظام نہیں کر پاتے۔ زندگی میں اصول و اقدار کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ میں نے دور بینی کو اپنی زندگی کا اصول بنا لیا تھا۔ میرے یہاں غم، افسردگی اور اضطراب کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ میرے والدین ہمیشہ میری پشت پر کھڑے رہے، انھوں نے کبھی مجھ پر کسی ملازمت یا شادی کے لیے دباؤ نہیں ڈالا۔ انھوں نے میری رہنمائی کی اور صحیح و غلط کا فرق سمجھایا۔ اپنے بھائی زہیر بن صغیر جو اس وقت یو پی میں سینئر سول سرونٹ ہیں، سے رہنمائی اور حوصلہ ملا، میری دونوں بہنیں وردا اور فضا میری تیاریوں میں مضبوط ستون بن کر کھڑی رہیں۔ یو پی پی سی ایس میں 57 واں رینک حاصل کرنے والی اریبہ نے اپنی کمیونٹی کے بارے میں کہا کہ میں اس کمیونٹی سے تعلق رکھتی ہوں جہاں ایسے مقابلہ جاتی امتحانات میں شرکت کا رجحان بہت کم اور مایوس کن ہے۔ خواتین کو آگے آنا چاہیے اور جدوجہد کر کے اچھا کرنا چاہیے۔ اریبہ صغیر نے تمام والدین کو یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلائیں اور لڑکیوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک لڑکے کو تعلیم یافتہ بنانا اسی تک محدود رہتا ہے جبکہ ایک لڑکی کو تعلیم یافتہ بنانا پوری نسل کو تعلیم یافتہ بنانا ہے اور تمام نوجوانوں کے لیے یہ پیغام دیا کہ 'ہمت نہ ہاریں، آگے بڑھتے رہیں'۔ اریبہ کو اس کی کامیابی پر ہر طرف سے مبارک باد مل رہی ہے۔

(نئی دہلی (ایس این بی)، راشٹریہ سہارا، 13 ستمبر 2020۔)

جاپان کی اوساکا دوسری بار یو ایس اوپن کوئین

جاپان کی چوتھی سیڈ اور سابق نمبر ایک کی نومی اوساکا نے ہفتہ کو تین سیٹوں میں ایک سیٹ سے پچھڑنے کے بعد بیلا روس کے وکٹوریہ ازارینکا کو 1-6، 6-3، 6-3 سے شکست دے کر زبردست واپسی کی اور یو ایس اوپن ٹینس ٹورنامنٹ کا اعزاز دوسری بار جیت لیا۔ اوساکا نے اپنا تیسرا

گرینڈ سلیم ٹائٹل جیت لیا ہے جبکہ آرزرینکا کا پہلی بار یو ایس اوپن ٹائٹل جیتنے کا خواب ایک بار پھر ٹوٹ گیا۔ جاپان کی عالمی نمبر 9 نومی اوساکا نے فائنل میں بیلا روس کی وکٹوریہ آزارینکا کو 1-6، 6-3، 6-3 سے شکست دی۔ اوساکا نے تین سالوں میں دوسری بار یو ایس اوپن جیتا ہے۔ وہ 26 سال میں پہلا سیٹ ہارنے کے بعد فائنل جیتنے والی کھلاڑی ہیں۔ اس سے پہلے 1994 میں اسپین کے ارانتا سانچیز وکاریو نے اسٹیفی گراف سے پہلا سیٹ ہارنے کے بعد فائنل جیتا تھا۔

اوساکا کو 30 ملین انعام کی رقم (تقریباً 22.54 کروڑ روپے) ملی۔ تاہم پچھلے سال کے مقابلے میں اس میں 8.50 لاکھ ڈالر (تقریباً چھ کروڑ 36 لاکھ روپے) کٹوتی کی گئی۔ اوساکا کا پہلا سیٹ 1-6 سے ہاریں لیکن پھر اگلے دو سیٹ جیت کر مقابلے میں واپسی کی۔ یہ 22 سالہ اوساکا کا تیسرا گرینڈ سلیم ٹائٹل ہے۔ اس سے قبل اوسا نے 2018 میں یو ایس اوپن جیتا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے 6 بار کی فاتح سرینا ولیمز کو شکست دی۔ ایک سال بعد انھوں نے آسٹریلیائی اوپن ٹائٹل جیتا۔ اوساکا نے سیمی فائنل میں جینیفر بریڈی کو (1)6-7، 8-3، 3-6 سے شکست دی۔ آزارینکا 7 سال بعد گرینڈ سلیم کے فائنل میں پہنچیں۔ انھیں تیسرا ٹائٹل جیتنے کا موقع ملا۔ وہ 2012 اور 2013 میں لگاتار دو سال آسٹریلیائی اوپن چیمپئن رہی ہیں۔

(نیویارک (یو این آئی) روزنامہ راشٹریہ سہارا، 13 ستمبر 2020)

سنگیتا نے اتر پردیش لوک سیوا آیوگ کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی

گروگرام شہر کے نیو شانتی نگر کی رہائش سنگیتا راگھو نے اتر پردیش لوک سیوا آیوگ کے امتحان میں دوسرا مقام حاصل کر کے شہر کا نام روشن کیا ہے۔ حالانکہ کچھ برسوں پہلے تک سنگیتا کو اس کامیابی کی تو کیا، اس امتحان میں بیٹھنے کی امید بھی نہیں تھی۔ انھوں نے اس وقت سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس طرح کے امتحان میں بیٹھیں گی۔

انھیں لگتا تھا کہ ان میں ہمت نہیں ہے، لیکن پھر انھوں نے یوگا کا دامن تھاما تو نہ صرف ان کے اندر خود اعتمادی بڑھی بلکہ ان کے اندر مثبت سوچ بھی پیدا ہوئی، جس نے ان کی زندگی کو ایک نئی سمت دی۔

پی ایچ ڈی چھوڑ کر شروع کی تیاری

ابتدائی تعلیم ممبئی سے حاصل کرنے کے بعد آگے کی اسکولی تعلیم انھوں نے شہر کے دیوسماج ودیا نکیتن اسکول سے حاصل کی۔ سیکٹر 14 میں واقع راج کنیہ مہیلا مہاودیالیہ سے انھوں نے بی ایس سی کی اور پھر دوارکا واقع اندر پرستھ یونیورسٹی سے نیچرل ریسورس مینیجمینٹ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ انھوں نے 2017 میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی شروع کی تھی، لیکن 2018 میں پی ایچ ڈی چھوڑ کر انھوں نے اس امتحان کی تیاری کی۔

والدین نے نہیں ڈالا دباؤ

سنگیتا نے ہمیشہ دیکھا کہ لڑکیوں کو زندگی کے ہر موڑ پر چیلنج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ چیلنج ہر جگہ ہوتے ہیں۔ ان کی دوست پڑھنا چاہتی تھیں، لیکن ان کے والدین نے پڑھنے نہیں دیا۔ سنگیتا کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ والدین نے ہمیشہ انھیں اپنے فیصلے خود لینے کی چھوٹ دی۔ ماں پون راگھو اور نیوی سے سبکدوش ان کے والد دنیش سنگھ راگھو بیٹی کی اس کامیابی سے بیحد خوش ہیں۔ انھوں نے کہا کہ لوگ کہتے تھے کہ بیٹی کی شادی کر دیں، لیکن انھیں بیٹی کے فیصلے اور جذبے پر پورا بھروسہ تھا۔

(دینک جاگرن، ہندی 12 ستمبر 2020)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ

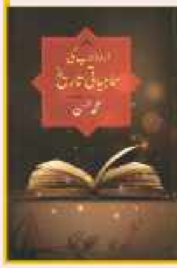

مصنف: محمد حسن

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 334

قیمت: 160 روپے

راسخ عظیم آبادی: کلاسیکیت، شعریت اور انفرادیت

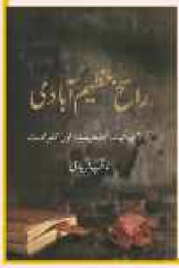

مصنف: ثاقب فریدی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 422

قیمت: 200 روپے

گرونانک: حیات وخدمات

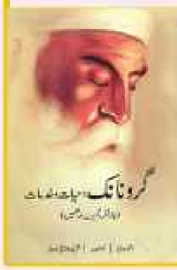

مرتبین: اختر الواسع، محمد حبیب

مفتی محمد مشتاق تجاروی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 190، قیمت: 110 روپے

حیاتیاتی تنوع اور ماحولیات کے مسائل

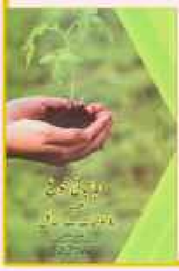

مصنف/مترجم: حافظ شائق احمد یحییٰ

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 132

قیمت: 90 روپے

ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات

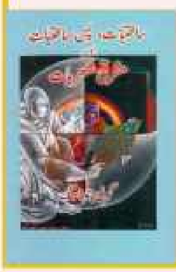

مصنف: گوپی چند نارنگ

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 620

قیمت: 275 روپے

ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں

مصنف: گوپی چند نارنگ

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 364

قیمت: 175 روپے

انیس (سوانح)

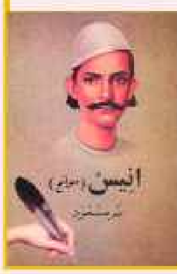

مصنف: نیر مسعود

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 427

قیمت: 220 روپے

کلیم عاجز

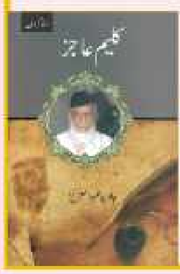

مصنف: جاوید عبدالعزیز

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 124

قیمت: 80 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly October 2020, Vol. 4, Issue: 10
RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025